

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ، تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید، تیرا جمالِ بے نقاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لفظ جب روح کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں تو وہ محض تحریر نہیں رہتے، بلکہ ایک جیتی جاگتی "داستان" بن جاتے ہیں۔ **"داستان پہلی سی"** ایک ایسا ہی ادبی سفر ہے جس کا مقصد اردو ادب کی کھوئی ہوئی چاشنی اور کہانیوں کے اس سحر کو دوبارہ زندہ کرنا ہے جو ہمیں اپنے ماضی، اپنی روایات اور اپنے جذبوں سے جوڑتا ہے۔

ہمارا یہ پہلا شمارہ (اپریل **2026**) ان کہی کہانیوں، ان دیکھے خوابوں اور ان مٹ یادوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہاں ہر لفظ ایک احساس ہے اور ہر کہانی ایک نیا جہان۔ ہم چاہتے ہیں کہ قارئین جب اس ڈائجیسٹ کا مطالعہ کریں، تو انہیں وہی پرانی اپنائیت اور وہی "پہلی سی" تڑپ محسوس ہو جو ادب کا خاصہ رہی ہے۔

محترم قارئینِ کرام!

آپ کا اور ہمارا رشتہ لفظوں کا رشتہ ہے۔ ایک لکھاری تب تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اسے ایک باذوق قاری میسر نہ ہو۔ **"داستان پہلی سی"** دراصل آپ کے ذوقِ مطالعہ کی ترجمان ہے۔

ہم نے اس سفر کا آغاز تو کر دیا ہے، لیکن اسے منزل تک پہنچانا اور اسے معتبر بنانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ کی پسندیدگی ہماری ہمت بڑھائے گی اور آپ کی تنقید ہمیں مزید بہتر کرنے کا حوصلہ دے گی۔

ہمیں انتظار رہے گا آپ کی قیمتی رائے کا، آپ کے تبصروں کا اور آپ کی ان کہانیوں کا جو شاید ابھی آپ کے دل کے کسی کونے میں محفوظ ہیں۔ آئیے، مل کر اس داستان کو آگے بڑھاتے ہیں۔

والسلام،

قلم کار کا تعارف

نام: کامی

تعلق: خانیوال، پاکستان

لفظوں کا سفر: میرا تعلق پاکستان کے اس خطے (خانیوال) سے ہے جہاں کی مٹی اپنی زرخیزی اور روایت پسندی کے لیے جانی جاتی ہے۔ ادب سے میرا لگاؤ محض ایک مشغلہ نہیں بلکہ زندگی کے حقائق کو لفظوں کے پیراہن میں ڈھالنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔

میرا نظریہ: میرا ماننا ہے کہ کہانیاں صرف تخیل نہیں ہوتیں، بلکہ یہ ہمارے معاشرے، ہمارے جذبوں اور ہماری روح کا عکس ہوتی ہیں۔ **"داستان پہلی سی"** کا آغاز میرے اسی خواب کی تعبیر ہے کہ اردو ادب کی وہی پرانی چاشنی اور سحر انگیزی کو دوبارہ زندہ کیا جائے جو دلوں کو چھو لے۔

قارئین سے رشتہ: میں اپنے قارئین کے لیے ایک ایسی دنیا تخلیق کرنا چاہتا ہوں جہاں وہ خود کو کہانی کا حصہ محسوس کریں۔ خانیوال کی اس مٹی سے اٹھنے والی یہ آواز امید ہے کہ آپ کے دلوں کے تاروں کو چھیڑے گی اور ہم مل کر اس ادبی سفر کو ایک نئی پہچان دیں گے



کہانی:روح کا انتقام

ازقلم : کامی

وادی کے دامن میں واقع وہ عظیم الشان حویلی جسے لوگ سفید حویلی کے نام سے جانتے تھے آج ماتم کدہ بنی ہوئی تھی فضا میں صندل اور گلاب کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو پھیلی تھی لیکن اس خوشبو کے نیچے چھپی موت کی بو باس ہر حساس دل کو لرزا رہی تھی عدنان جو تینوں بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہنس مکھ اور جفاکش تھا ایک

ناگہانی حادثے میں خالق حقیقی سے جا ملا تھا
پورے گاؤں میں عدنان کی شرافت کی مثالیں دی جاتی تھیں اس نے اپنے حصے کی زمینوں کو اپنی محنت سے سونا بنا دیا تھا لیکن شاید یہی سونا اس کے بھائیوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا
حویلی کے مردانہ خانے میں لوگوں کا تانتا بندھا تھا لیکن اندرونی دالان کے ایک تاریک گوشے میں جہاں پرانی لکڑی کی کرسیاں رکھیں ہوئیں تھیں عدنان کے دو بڑے بھائی اشفاق اور اکرام بیٹھے تھے اشفاق جو عمر میں سب سے بڑا تھا اپنی موٹی اور بے رحم آنکھوں سے مسلسل صحن میں بیٹھے عدنان کے دو معصوم بچوں سیف اور سفیان کو دیکھ رہا تھا جو اپنے باپ کے بچھڑنے کے غم سے نڈھال ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بیٹھے تھے

اشفاق نے سگریٹ کا دھواں فضا میں اچھالتے ہوئے نہایت سرد لہجے میں کہا اکرام یہ غم اور آنسو صرف دکھاوا ہیں اصل حقیقت یہ ہے کہ عدنان کی وصیت کے مطابق یہ آدھی حویلی اور نہر کنارے والے قیمتی باغات اب ان یتیموں کے نام ہو جائیں گے

اکرام جو طبعاً بزدل تھا مگر لالچ اس کے رگ و پے میں بھی بسا تھا تھوک نگلتے ہوئے بولا لیکن بھائی جان اب تو عدنان چلا گیا زینب بھابھی اکیلی جان ہیں وہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گی

اشفاق نے حقارت سے اسے دیکھا بیوقوف وہ اکیلی نہیں اس کے پیچھے یہ دو وارث پل رہے ہیں کل کو یہ سیف اور سفیان جوان ہوں گے تو ہم سے حساب مانگیں گے جائیداد بانٹنے سے بہتر ہے کہ جڑ ہی کاٹ دی جائے

اکرام کے ماتھے پر پسینہ آ گیا لیکن لوگوں کو کیا جواب دیں گے

اشفاق کے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ آئی پہلے جڑ کاٹیں گے پھر شاخیں آج رات زینب کا قصہ تمام کرنا ہوگا اگر وہ نہ رہی تو بچوں کی کفالت کے نام پر جائیداد کے مختار عام ہم بن جائیں گے پھر ان بچوں کا جو بھی حشر ہو کسی کو شک نہیں ہوگا

رات کے سائے گہرے ہوتے ہی حویلی میں ایک عجیب سی منحوس خاموشی چھا گئی زینب اپنے کمرے میں مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی اس کی آنکھیں رو رو کر سوج چکی تھیں اس نے مڑ کر دیکھا سیف اور سفیان ایک دوسرے کے قریب دبکے گہری نیند سو رہے تھے اسے رہ رہ کر عدنان کی یاد تڑپا رہی تھی مگر اسے کیا معلوم تھا کہ موت اس کی دہلیز پر دستک دے چکی ہے

اچانک کمرے کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اشفاق اور اکرام اندر داخل ہوئے زینب چونک کر کھڑی ہوگئی بھائی جان آپ

اس وقت سب خیریت تو ہے
اشفاق نے ایک مصنوعی ہمدردی بھرا چہرہ بنایا زینب تم شام سے کچھ کھا پی نہیں رہی ہو یہ دودھ کا گلاس پی لو تمہیں ہمت چاہیے سیف اور سفیان کا سوچو اس نے کانپتے ہوئے اکرام کے ہاتھ سے گلاس لے کر زینب کی طرف بڑھایا
زینب جو ان دونوں کو اپنے سگے بھائیوں کی طرح مانتی تھی ان کی آنکھوں میں چھپا زہر نہ دیکھ سکی اس نے لرزتے ہاتھوں سے گلاس تھاما اور ایک ہی سانس میں پی گئی
کچھ ہی منٹ گزرے تھے کہ زینب کو محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں آگ لگ گئی ہو اس کا سانس اکھڑنے لگا اور حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی وہ تڑپ کر فرش پر گری اور اپنے بچوں کی طرف ہاتھ پھیلایا جیسے انہیں پکار رہی ہو
میرے بچے اس کے لبوں سے نکلا آخری لفظ

یہی تھا
اشفاق اور اکرام ساکت کھڑے اسے تڑپتا دیکھتے رہے جب زینب کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بچوں پر جم گئیں تو اشفاق نے سکون کا سانس لیا
اگلی صبح حویلی سے ایک اور جنازہ اٹھا گاؤں والے حیران تھے کہ جوان بخت زینب اتنی جلدی کیسے دنیا چھوڑ گئی تدفین کے بعد جب اشفاق اور اکرام واپس لوٹے تو حویلی کے برآمدے میں کھڑے سیف اور سفیان کی سسکیوں نے پتھر دل انسان کو بھی رلا دیا ہوتا مگر ان دونوں کے دل تو پتھر سے بھی سخت تھے
رات ہوتے ہی اشفاق نے اکرام کو اپنے کمرے میں بلایا آج رات کا کام آخری ہے ان بچوں کو نیند کی گولی دے کر نہر میں بہا آئیں گے بات ختم جائیداد ہماری
وہ دونوں جب دبے پاؤں بچوں کے کمرے کی

طرف بڑھے تو اچانک حویلی کا بھاری لکڑی کا دروازہ خود بخود دھماکے سے بند ہوا صحن میں لگی نیم کے درخت کی شاخیں زور زور سے ہلنے لگیں حالانکہ باہر ہوا کا نام و نشان نہ تھا

جیسے ہی وہ بچوں کے کمرے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھنے لگے کمرے کے اندر سے ایک مدھم سی لوری سنانے کی آواز آئی وہی لوری جو زینب اکثر اپنے بچوں کو سناتی تھی

وہ دونوں وہیں جم کر رہ گئے کمرے کی دراڑ سے ایک نیلی سی روشنی باہر چھن کر آ رہی تھی اشفاق نے ہمت جمع کی اور جیسے ہی دروازہ کھولا اس کی چیخ نکل گئی

سامنے بیڈ پر سیف اور سفیان پرسکون سو رہے تھے لیکن ان کے سرہانے ایک دھندلا سا سایہ بیٹھا تھا جس کا چہرہ بالکل زینب جیسا تھا مگر اس کی آنکھیں شعلوں کی طرح دہک رہی تھیں اس سائے نے اپنی انگلیاں لبوں پر

رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور
پھر اس کی گردن آہستہ آہستہ مڑی
ایک ایسی وحشت ناک چیخ فضا میں گونجی
اشفاق اور اکرام الٹے قدموں پیچھے بھاگے
لیکن برآمدے کا فرش اچانک برف کی طرح
ٹھنڈا ہو گیا
زینب کی روح اب دیواروں پر رینگتی ہوئی ان
کی طرف بڑھ رہی تھی اور حویلی کی
دیواروں سے ایک ہی آواز گونج رہی تھی
میرے بچوں کو چھو کر تو دیکھو
اشفاق اور اکرام کی روحیں فنا ہونے لگیں وہ
ہذیانی انداز میں پیچھے بھاگے لیکن برآمدے
کی دیواریں جیسے ساکت ہو گئی تھیں زینب
کی روح جو ایک دھندلے سائے کی طرح
دیواروں پر لہراتی ہوئی ان کے تعاقب میں
تھی اب ان کے عین سامنے فرش سے ابھری
اس کا چہرہ وہی تھا وہی معصومیت اور وہی
نقوش مگر آنکھوں میں موجود سفیدی ختم

ہو چکی تھی اور وہاں صرف ایک گہری دہکتی ہوئی سیاہی تھی

تمہارا تمہارا جنازہ تو آج ہی اٹھا ہے اکرام کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے اس کے دانت بج رہے تھے اور پتلون پسینے اور خوف سے تر ہو چکی تھی

زینب کی روح نے کوئی جواب نہ دیا مگر اس کے اردگرد موجود ہوا اچانک اتنی ٹھنڈی ہوگئی کہ اشفاق اور اکرام کے منہ سے بھاپ نکلنے لگی اچانک حویلی کے تمام چراغ اور بلب ایک زوردار دھماکے سے پھٹ گئے مکمل اندھیرا چھا گیا سوائے اس نیلی روشنی کے جو اس روح کے گرد ہالے کی صورت میں موجود تھی

اشفاق بھائی بھاگو اکرام چلایا اور مرکزی دروازے کی طرف دوڑا لیکن جیسے ہی اس نے دروازے کے ہینڈل کو ہاتھ لگایا اسے محسوس ہوا جیسے اس نے دہکتے ہوئے کوئلے پکڑ لیے

ہوں اس کے ہاتھوں سے کھال جھلسنے کی بو آنے لگی
اشفاق جو خود کو بڑا بہادر سمجھتا تھا زمین پر گر کر رینگنے لگا زینب ہمیں معاف کر دو ہم ہم ان بچوں کا خیال رکھیں گے اس نے گڑگڑا کر کہا
اچانک ایک بھاری اور گونجتی ہوئی آواز جو حویلی کے در و دیوار سے ٹکرا رہی تھی سنائی دی
تم نے ان کا حق چھینا ان کا سہارا چھینا اب تم ان کی نیند چھیننے آئے تھے
روح کا ہاتھ آہستہ آہستہ بلند ہوا اور اشفاق کا جسم خود بخود زمین سے اوپر اٹھنے لگا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے گلے سے جکڑ لیا ہو اس کے پیر ہوا میں لٹکنے لگے اور چہرہ نیلا پڑنے لگا اکرام یہ منظر دیکھ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا اور بے ہوش ہوگیا
اسی لمحے برابر والے کمرے سے چھوٹے سفیان

کے رونے کی آواز آئی امی امی کہاں ہیں آپ سفیان کی آواز سنتے ہی وہ وحشت ناک ماحول لمحوں میں بدل گیا اشفاق دھڑام سے فرش پر گرا زینب کی روح کا رخ فوراً بچوں کے کمرے کی طرف ہوا وہ دیواروں کے آر پار ہوتی ہوئی سفیان کے پاس پہنچی

سفیان بستر پر بیٹھا آنکھیں مل رہا تھا جبکہ سیف اب بھی گہری نیند میں تھا سفیان کو محسوس ہوا جیسے کسی نے بہت پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ہو اسے ایک جانی پہچانی خوشبو آئی وہی خوشبو جو اس کی ماں کے دوپٹے سے آتی تھی

امی سفیان نے اندھیرے میں پکارا اسے کوئی نظر تو نہ آیا مگر اسے ایسا لگا جیسے اسے کسی نے گرمجوشی سے گلے لگا لیا ہو اس کا ڈر ختم ہو گیا اور وہ دوبارہ تکیے پر سر رکھ کر سو گیا

کمرے کے باہر اشفاق ہانپتا ہوا کھڑا ہوا اس

کی گردن پر انگلیوں کے نیلے نشان ابھر آئے تھے اس نے اکرام کو جھنجھوڑا اٹھ کم بخت اٹھ ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا

وہ دونوں گرتے پڑتے حویلی کے بیرونی صحن کی طرف بھاگے بارش اب تھم چکی تھی لیکن رات کا سناٹا پہلے سے زیادہ بھیانک تھا اشفاق نے پیچھے مڑ کر دیکھا دوسری منزل کی کھڑکی پر وہی سایہ کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا

بھائی جان اب کیا ہوگا وہ ہمیں نہیں چھوڑے گی اکرام نے روتے ہوئے کہا

اشفاق نے غصے اور خوف کے ملے جلے جذبات سے اپنی مٹھی بھینچی وہ ایک روح ہے اکرام ہم کسی پہنچے ہوئے عامل کو لائیں گے اسے دوبارہ قبر میں دفن کرنا ہوگا اس بار ہمیشہ کے لیے

وہ رات تو گزر گئی مگر حویلی کے در و دیوار گواہ تھے کہ اب یہاں صرف زندوں کا راج نہیں رہا تھا زینب اپنی ممتا کا حصار باندھ

چکی تھی اور یہ تو صرف آغاز تھا
اشفاق اور اکرام ہانپتے کانپتے حویلی کے بیرونی صحن میں پہنچے جہاں رات کی سرد ہوا ان کے چہروں سے ٹکرا رہی تھی اکرام کے دانت اب بھی بج رہے تھے اور اس کا پورا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا
بھائی جان وہ وہ زینب بھابھی ہی تھیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اکرام نے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے بمشکل کہا
اشفاق نے غصے سے اس کا گریبان پکڑا اور اسے جھنجھوڑا چپ کر بزدل وہ کوئی روح وہ نہیں تھی یہ سب ہمارا وہم ہے ہم نے اسے زہر دیا ہم نے اسے دفنایا مردے واپس نہیں آتے
لیکن اشفاق کے اپنے ماتھے پر پسینے کے قطرے اس کے جھوٹ کی گواہی دے رہے تھے اس کی گردن پر موجود نیلے نشان اب گہرے ہو کر کالے پڑنے لگے تھے جن میں ایک عجیب سی جلن محسوس ہو رہی تھی

اسی لمحے حویلی کے اندر سے سیف کے کمرے
کی کھڑکی زور سے کھلی اور پٹخ کر بند ہوئی
دونوں بھائیوں کی نظریں اوپر اٹھیں وہاں
اندھیرے میں ایک سفید سایہ ساکن کھڑا
انہیں دیکھ رہا تھا وہ سایہ آہستہ آہستہ
کھڑکی سے باہر نکلا اور ہوا میں معلق ہوتا ہوا
نیچے صحن کی طرف بڑھنے لگا
بھاگو اکرام اشفاق کی ہمت جواب دے گئی
وہ دونوں حویلی کے پچھلے دروازے کی طرف
بھاگے جو اصطبل کی طرف جاتا تھا وہاں
پہنچ کر انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا
اور لکڑی کے بڑے بڑے لٹھوں کے پیچھے چھپ
گئے باہر گھوڑے بے چین ہو کر ہنہنا رہے تھے
اور اپنے کھروں سے زمین کھود رہے تھے
جیسے انہیں کسی غیر مرئی وجود کی
موجودگی کا احساس ہو رہا ہو
اچانک اصطبل کی چھت پر لگی ٹین کی
چادروں پر کسی کے چلنے کی آواز آئی جیسے

کوئی ننگے پاؤں چل رہا ہو
وہ اوپر ہے اکرام نے سسکتے ہوئے سرگوشی کی
پھر ایک دم خاموشی چھا گئی اتنی گہری خاموشی کہ انہیں اپنی سانسوں کی آواز بھی دھونکنی کی طرح سنائی دینے لگی اکرام نے ڈرتے ڈرتے اوپر دیکھا چھت کی ایک دراڑ سے خون کی سرخ بوندیں ٹپک رہی تھیں ایک بوند اکرام کے گال پر گری اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو وہ واقعی تازہ خون تھا
بھائی جان یہ یہ کیا ہے اکرام کی چیخ نکل گئی
اشفاق نے اوپر دیکھا تو اس کی روح فنا ہوگئی چھت کی دراڑ سے زینب کا چہرہ نیچے لٹک رہا تھا لیکن اس کی گردن کسی غیر قدرتی حد تک مڑی ہوئی تھی اور اس کے لمبے سیاہ بال سانپوں کی طرح لہرا رہے تھے اس کے چہرے سے گوشت لٹک رہا تھا جیسے اسے ابھی ابھی کسی نے نوچا ہو

تم نے میرے بچوں کو یتیم کیا روح کی آواز
اصطبل کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجنے لگی
تم نے ان کی ماں کو چھینا اب میں تمہارا
سکون چھین لوں گی
اچانک اصطبل میں بند گھوڑے بپھر گئے ایک
کالے گھوڑے نے زوردار لات ماری اور اپنا رسہ
تڑا لیا وہ دیوانہ وار اکرام اور اشفاق کی طرف
بڑھا اشفاق نے جان بچانے کے لیے چھلانگ
لگائی لیکن اکرام کا پاؤں گھاس میں پھنس
گیا گھوڑے کا بھاری سم اکرام کے ہاتھ پر پڑا
اور ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی
آہ میرا ہاتھ اکرام درد سے تڑپنے لگا
اشفاق نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور کسی
طرح اصطبل سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوا
وہ دیوانہ وار گاؤں کی کچی سڑک پر بھاگنے
لگے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حویلی کے صدر
دروازے پر زینب کھڑی تھی اس کے ایک ہاتھ
میں وہ زہریلی بوتل تھی جو اشفاق نے

استعمال کی تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ سیف اور سفیان کے کمرے کی طرف اشارہ کر رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ اب ان بچوں کا محافظ کوئی انسان نہیں بلکہ ایک لرزہ خیز روح ہے

وہ دونوں بھاگتے بھاگتے گاؤں کے قبرستان کے قریب پہنچے تو دور سے فجر کی اذان کی آواز سنائی دی اذان کی آواز بلند ہوتے ہی وہ بھاری بوجھ جو ان کے اعصاب پر سوار تھا ایک دم ختم ہو گیا فضا میں پھیلی وہ وحشت ناک خوشبو غائب ہو گئی اور ہر طرف معمول کی خاموشی چھا گئی

اشفاق زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگا اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اکرام اپنے ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو تھامے درد سے کرا رہا تھا

اکرام اشفاق نے سرد لہجے میں کہا اب یہ جنگ صرف جائیداد کی نہیں رہی وہ ہمیں مار دے گی ہمیں آج ہی شہر جانا ہوگا اور بابا

سائیں کو لے کر آنا ہوگا سنا ہے وہ بھٹکتی روحوں کو بوتل میں بند کر دیتے ہیں
اکرام نے لرزتی آواز میں پوچھا اور اگر وہ نہ مانی تو
اشفاق کی آنکھوں میں وحشت تھی تو پھر ہمیں ان بچوں کو مارنا ہی ہوگا کیونکہ وہی اس روح کی طاقت ہیں جب بچے نہیں رہیں گے تو وہ کس کی حفاظت کرے گی
اشفاق کا یہ جملہ فضا میں لہرایا ہی تھا کہ زمین کے نیچے سے ایک ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی جیسے کوئی ان کی بیوقوفی پر ماتم کر رہا ہو
اشفاق کے ان الفاظ نے فضا میں موجود سردی کو مزید سنگین کر دیا اکرام نے اپنے بھائی کا چہرہ دیکھا جہاں لالچ اور خوف نے مل کر ایک ایسی درندگی پیدا کر دی تھی جو کسی شیطان سے کم نہ تھی وہ اپنے ہی بھائی کے بچوں سیف اور سفیان کو نشانہ بنانے کی بات

کر رہا تھا صرف اس لیے کہ وہ اپنی جان اور جائیداد بچا سکے

بھائی جان گناہ پر گناہ نہ کریں اکرام نے لرزتے ہوئے کہا ہم نے زینب بھابھی کو مارا عدنان بھائی کی امانت میں خیانت کی اب ان معصوموں کو

خاموش ہو جاؤ اشفاق نے دھاڑ کر اسے چپ کرایا اگر وہ جئیں گے تو وہ روح طاقتور ہوتی جائے گی ممتا کی جڑ وہ بچے ہیں جڑ کٹے گی تو سایہ خود بخود غائب ہو جائے گا

وہ دونوں ابھی قبرستان کے پاس کھڑے ہی تھے کہ اچانک زمین لرزنے لگی اکرام کی نظر اپنے پیروں کے پاس پڑی ایک پرانی شکستہ قبر پر پڑی وہ قبر کسی اور کی نہیں زینب کی تھی جسے کل ہی دفنایا گیا تھا قبر کی مٹی میں دراڑیں پڑ رہی تھیں اور اندر سے ایک ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی ناخنوں سے لکڑی کے تختے کھرچ رہا ہو

وہ وہ باہر آ رہی ہے اکرام دیوانہ وار بھاگا
اشفاق نے پیچھے مڑ کر دیکھا قبر سے ایک
سفید کفن پوش ہاتھ باہر نکلا جس کی
انگلیاں مٹی میں دھنسی ہوئی تھیں اس ہاتھ
نے مٹی کو مضبوطی سے جکڑا اور ایک ہی
جھٹکے میں قبر کا ایک حصہ بیٹھ گیا اشفاق
کی ہمت جواب دے گئی وہ اپنی گردن پر
موجود جلن کو بھول کر اکرام کے پیچھے بھاگا
صبح کے اجالے میں حویلی کا منظر جتنا
پرسکون تھا اتنا ہی پر فریب بھی سیف اور
سفیان اب جاگ چکے تھے اور اپنی ماں کو
ڈھونڈ رہے تھے چھوٹے سفیان کی ہچکیاں
بندھ گئی تھیں

بھیا امی کہاں ہیں کل رات انہوں نے مجھے
پیار کیا تھا لیکن اب وہ مل نہیں رہیں سفیان
نے روتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کا قمیض پکڑا
سیف جو ابھی صرف آٹھ سال کا تھا اپنے اندر
کے دکھ کو چھپا کر سفیان کے آنسو پونچھنے

لگا سفیان امی اور ابو اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں لیکن تایا ابو نے کہا تھا کہ وہ ہمارا خیال رکھیں گے

اسی لمحے اشفاق اور اکرام حویلی میں داخل ہوئے اکرام کا ہاتھ پٹی میں بندھا تھا اور اشفاق کی آنکھیں سرخ تھیں سیف دوڑ کر ان کے پاس گیا تایا ابو سفیان رو رہا ہے اسے بھوک لگی ہے

اشفاق نے سیف کو دیکھا اس کے ذہن میں رات کا وہ بھیانک منظر اور اپنا وہ خونی منصوبہ گھوم گیا اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنے چہرے پر ایک مصنوعی ہمدردی سجائی بیٹا پریشان نہ ہو ہم شہر جا رہے ہیں تمہارے لیے ڈھیر سارے کھلونے اور مٹھائی لائیں گے تم دونوں گھر کے اندر ہی رہنا باہر مت نکلنا

اس نے اکرام کو اشارہ کیا اور وہ دونوں خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی

طرف نکل گئے ان کا رخ کالے برج کی طرف
تھا جہاں بابا مہیب نامی ایک کالا علم جاننے
والا عامل رہتا تھا جس کے بارے میں مشہور
تھا کہ وہ روحوں کو قید کرنے کا ماہر ہے
شہر کے تنگ و تاریک راستوں سے گزر کر وہ
ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ہر طرف انسانی
کھوپڑیاں اور جانوروں کی ہڈیاں بکھری ہوئی
تھیں بابا مہیب جس کی آنکھیں غیبی
طاقتوں کی وجہ سے بالکل سفید ہو چکی
تھیں ایک چٹائی پر بیٹھا کچھ پھونک رہا تھا
تمہارے پیچھے ایک بہت طاقتور اور غصیلی
روح ہے بابا مہیب نے ان کے بولنے سے پہلے ہی
کہا اس کی آواز ایسی تھی جیسے دو پتھر
آپس میں رگڑ کھا رہے ہوں
اشفاق نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہا بابا وہ
ہمیں جینے نہیں دے گی وہ جائیداد کی نہیں
بدلے کی طالب ہے ہمیں اس سے نجات دلائیں
عامل نے ایک گندی سی ہنڈیا میں کچھ جڑی

بوٹیاں ڈالیں اور بولا وہ ماں ہے اور ماں کی روح تب تک نہیں جاتی جب تک اس کے بچے محفوظ ہوں اگر تم اسے قید کرنا چاہتے ہو تو مجھے اس حویلی میں لانا ہوگا جہاں اس کا خون گرا تھا مجھے ان بچوں کے خون کے چند قطرے بھی چاہیے ہوں گے تاکہ میں حصار معکوس تیار کر سکوں

اشفاق کا دل لرزا مگر جائیداد کی ہوس نے اسے اندھا کر رکھا تھا ٹھیک ہے بابا جو آپ کہیں گے وہی ہوگا

ادھر حویلی میں شام کے سائے ڈھل رہے تھے سیف اور سفیان صحن میں بیٹھے تھے کہ اچانک حویلی کا بڑا دروازہ خود بخود کھل گیا ایک تیز ہوا کا جھونکا اندر داخل ہوا جس نے صحن میں موجود سوکھے پتوں کو رقص پر مجبور کر دیا

سفیان ڈر کر سیف سے لپٹ گیا بھیا مجھے ڈر لگ رہا ہے

اچانک دالان کی دیوار پر ایک سایہ ابھرا وہ سایہ کسی ڈراؤنی چیز کا نہیں تھا بلکہ ایک عورت کا تھا جس نے سر پر دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا دیوار سے ایک مدھم میٹھی اور لرزتی ہوئی آواز آئی

میرے بچو ڈرو مت میں یہیں ہوں

سیف نے دیوار کی طرف دیکھا امی کیا آپ آگئی ہیں

سایہ لہرایا اور سیف کے گال پر ایک ٹھنڈا مگر مامتا بھرا لمس محسوس ہوا بچوں کا ڈر ایک دم ختم ہو گیا انہیں ایسا لگا جیسے وہ دنیا کی سب سے محفوظ جگہ پر ہیں لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ شہر سے ان کا تایا موت کا سامان لے کر آ رہا ہے

شہر کی آلودہ فضاؤں سے نکل کر جب اشفاق کی گاڑی واپس گاؤں کی کچی سڑک پر مڑی تو سورج غروب ہو رہا تھا آسمان کا رنگ گہرا سرخ تھا جیسے کسی نے افق پر خون چھڑک

دیا ہو گاڑی کی پچھلی نشست پر بابا مہیب بیٹھا تھا جس کے گلے میں انسانی ہڈیوں کی مالا تھی اور اس کے جھولے سے ایک عجیب سی سڑاند آ رہی تھی

اس حویلی کی مٹی پکار رہی ہے بابا مہیب نے اپنی سفید آنکھیں میچتے ہوئے غراہٹ بھری آواز میں کہا تم نے جس عورت کو مارا ہے اس کی ممتا اب ایک بلا بن چکی ہے وہ صرف بدلہ نہیں چاہتی وہ اپنے بچوں کے گرد ایک ایسا حصار باندھ چکی ہے جسے توڑنا عام عامل کے بس کی بات نہیں

اشفاق نے سٹیئرنگ پر گرفت مضبوط کی اس کے ماتھے پر پسینہ تھا بابا مجھے وہ جائیداد چاہیے اور اپنی جان بھی آپ جو مانگیں گے میں دوں گا بس اس روح کو ہمیشہ کے لیے قید کر دیں

حویلی پہنچتے ہی فضا بدل گئی سیف اور سفیان دالان میں بیٹھے تھے لیکن جیسے ہی

بابا مہیب نے دہلیز پر قدم رکھا حویلی کے
تمام کبوتر یکدم اڑنے لگے اور دیواروں پر
بیٹھے کوے چیخنے لگے
سفیان ڈر کر سیف کے پیچھے چھپ گیا بھیا
یہ ڈراؤنا آدمی کون ہے
سیف نے ہمت جمع کی اور آگے بڑھا تایا ابو یہ
بابا کون ہیں
اشفاق نے سیف کو جھڑک دیا تم دونوں اپنے
کمرے میں جاؤ اور دروازہ اندر سے بند کر لو
جب تک میں نہ کہوں باہر مت آنا
جیسے ہی بچے اپنے کمرے کی طرف بڑھے بابا
مہیب نے سیف کا راستہ روکا اس نے اپنے
میلے ہاتھ سے سیف کی کلائی پکڑی اورایک
چھوٹی سی چھری نکالی اور بجلی کی تیزی
سے سیف کی انگلی پر ایک کٹ لگا دیا
آہ سیف کی چیخ نکل گئی خون کی چند
بوندیں فرش پر گریں جنہیں عامل نے فوراً
ایک تانبے کی پیالی میں جمع کر لیا

یہ کیا کر رہے ہیں آپ سیف روتے ہوئے اپنے
بھائی کو لے کر کمرے میں بھاگا
خون مل گیا بابا مہیب نے وحشیانہ مسکراہٹ
کے ساتھ کہا اب کھیل شروع ہوگا
عامل نے حویلی کے وسطی صحن میں ایک
دائرہ کھینچا اور اس میں کالا علم پڑھنا
شروع کیا اس نے سیف کے خون میں کچھ
کالی راکھ ملائی اور اسے چاروں سمتوں میں
چھڑک دیا اے بھٹکتی روح اگر تو ماں ہے تو
سامنے آ تیرے بچے کا خون پکار رہا ہے تجھے
اچانک حویلی کا درجہ حرارت گر گیا صحن
میں موجود نیم کا پرانا درخت زور زور سے
جھولنے لگا فضا میں ایک ایسی سسکی
گونجی جو دل چیر دینے والی تھی
وہ آ رہی ہے اکرام لرزتے ہوئے بولا
صحن کے کونے سے ایک دھواں سا اٹھا جو
آہستہ آہستہ زینب کی شکل اختیار کرنے لگا
لیکن اس بار اس کا روپ پہلے سے کہیں زیادہ

بھیانک تھا اس کے بال زمین تک لٹک رہے تھے لباس خون آلود تھا اور اس کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہہ رہے تھے اس نے دیکھا کہ اس کے معصوم بیٹے کا خون اس ظالم عامل کے ہاتھ میں ہے تو اس کے منہ سے ایک ایسی چنگھاڑ نکلی کہ حویلی کی کھڑکیوں کے شیشے چور چور ہوگئے

باز آ جا خبیث انسان روح کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر گونجی میرے بچوں کا خون بہا کر تو مجھے قید نہیں کر سکتا

بابا مہیب نے ایک منتر پڑھ کر آگ کا ایک گولہ روح کی طرف پھینکا میں تجھے پاتال میں دفن کر دوں گا

زینب کی روح لہرائی اور ایک دم غائب ہوگئی اگلے ہی لمحے عامل کی پیٹھ پر ناخنوں کے گہرے نشان ابھر آئے وہ کراہ کر گرا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اس نے پیالی میں موجود خون کو آگ دکھا دی اور ایک حصار معکوس

بنانا شروع کر دیا جس کا مقصد روح کو ایک چھوٹی سی مٹی کی ہنڈیا میں قید کرنا تھا بچوں کے کمرے میں سیف اور سفیان خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی

ٹھک ٹھک ٹھک

سیف سفیان دروازہ کھولو یہ اشفاق کی آواز تھی مگر اس میں ایک عجیب سی کھنک تھی سیف دروازے کی طرف بڑھا لیکن اسے اپنی ماں کی وہی لوری یاد آئی جو وہ بچپن میں سناتی تھی اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے پیچھے کھینچ رہا ہے اس نے دروازے کے نیچے کی دراڑ سے دیکھا باہر کھڑے شخص کے پیر الٹے تھے

بھیا مت کھولنا سفیان چلایا

باہر کھڑے اشفاق جو دراصل روح کا ایک فریب تھا یا شاید عامل کا کوئی وار نے غصے سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا کھولو ورنہ میں

تمہیں زندہ جلا دوں گا
اسی وقت صحن میں ایک زوردار دھماکہ ہوا
بابا مہیب کی ہنڈیا پھٹ گئی اور کالا دھواں
ہر طرف پھیل گیا زینب کی روح اب عامل کے
سامنے نہیں بلکہ اپنے بچوں کے کمرے کے
سامنے ڈھال بن کر کھڑی تھی اس کا قد اتنا
بڑھ گیا کہ وہ حویلی کی چھت سے جا ٹکرایا
اس نے اپنا ایک ہاتھ اشفاق کی طرف بڑھایا
اور اسے گردن سے پکڑ کر ہوا میں اٹھا لیا تم
نے میرے بیٹے کا خون بہایا ہے اب میں تمہاری
رگوں کا خون خشک کر دوں گی
اشفاق کا جسم ہوا میں معلق تھا اس کے پاؤں
بے بسی سے تھرک رہے تھے اور چہرہ شدت
کرب سے نیلا پڑتا جا رہا تھا زینب کی روح کی
گرفت اس کے گلے پر اتنی مضبوط تھی کہ
اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی شہ
رگ ابھی پھٹ جائے گی
زینب رحم اشفاق کے حلق سے ایک گھٹی

گھٹی آواز نکلی
لیکن روح کی آنکھوں میں رحم کا کوئی نشان نہ تھا اس کی دہکتی ہوئی سیاہ آنکھوں سے ایک عجیب سی نفرت جھلک رہی تھی تم نے میرے سیف کا خون بہایا تم نے میرے جگر گوشے کو تکلیف دی روح کی آواز پوری حویلی میں ایک ارتعاش پیدا کر رہی تھی
ادھر صحن میں بابا مہیب جس کی ہنڈیا پھٹ چکی تھی زمین پر گرا ہانپ رہا تھا اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں وحشت اور جنون اب بھی باقی تھا اس نے اپنے جھولے سے ایک پرانی کالی جلد والی کتاب نکالی اور اس کے اوراق تیزی سے پلٹنے لگا
اشفاق ہمت مت ہارو میں اس کا حصار توڑ رہا ہوں عامل نے چیخ کر کہا اور زمین پر پڑی راکھ سے ایک ستارہ پنتاگرام بنانا شروع کر دیا اس نے سیف کے خون والی پیالی دوبارہ

اٹھائی اور اسے الٹا کر کے راکھ پر چھڑک دیا
خون کے بدلے خون روح کے بدلے روح اس کی
ممتا کو اس کی زنجیر بنا دو
عامل کے منتر پڑھتے ہی حویلی کے در و دیوار
لرزنے لگے بچوں کے کمرے کے اندر سے سیف
اور سفیان کی چیخیں بلند ہوئیں امی بچائیں
امی
زینب کی روح تڑپ اٹھی اس نے اشفاق کو
ایک طرف پٹخا اور تیزی سے مڑی عامل کا کالا
علم اب براہ راست بچوں کی زندگی پر اثر کر
رہا تھا کمرے کے اندر دیواروں سے کالے سائے
نکل کر سیف اور سفیان کی طرف بڑھ رہے تھے
زینب کی روح دیواروں کے آر پار ہوتی ہوئی
کمرے میں داخل ہوئی اس نے اپنے دونوں ہاتھ
پھیلا دیے اور بچوں کے گرد ایک نورانی ہالہ
بنا لیا وہ کالے سائے جو عامل کے بھیجے ہوئے
تھے اس نورانی ہالے سے ٹکرا کر راکھ بن رہے
تھے لیکن ہر سائے کو ختم کرنے کے بدلے زینب

کی روح کی چمک مدھم پڑتی جا رہی تھی وہ اپنی طاقت اپنے بچوں کو بچانے میں صرف کر رہی تھی

باہر صحن میں اشفاق کھانستا ہوا اٹھا اور اکرام کے پاس پہنچا جو خوف سے بے ہوش ہونے کے قریب تھا اکرام جلدی کر بابا مہیب کہہ رہے ہیں کہ جب تک یہ بچے زندہ ہیں یہ روح ختم نہیں ہوگی ہمیں ان کا کام تمام کرنا ہوگا ابھی اور اسی وقت

اکرام نے لرزتے ہوئے اپنے بھائی کو دیکھا بھائی جان وہ ہمارے اپنے خون ہیں

خون سفید ہو چکا ہے اکرام اشفاق نے ایک بھاری کلہاڑی اٹھائی جو پاس ہی لکڑی کاٹنے کے لیے رکھی تھی اگر وہ نہ مرے تو یہ روح ہمیں کتے کی موت مارے گی

وہ دونوں کمرے کی طرف بڑھے بابا مہیب مسلسل منتر پڑھ رہا تھا جس کی وجہ سے زینب کی روح کمرے کے اندر بچوں کو بچانے

میں مصروف تھی اور باہر کی دنیا سے کٹ
چکی تھی اشفاق نے زوردار لات مار کر کمرے
کا دروازہ توڑ دیا
اندر کا منظر ہولناک تھا سیف اور سفیان کونے
میں دبکے ہوئے تھے اور ان کے سامنے زینب کی
روح ایک ڈھال بنی کھڑی تھی مگر اس کا
جسم اب شفاف ہوتا جا رہا تھا وہ کمزور پڑ
رہی تھی
اشفاق کلہاڑی تان کر بچوں کی طرف لپکا آج
تمہارا قصہ ختم
جیسے ہی کلہاڑی ہوا میں لہرائی زینب کی
روح نے ایک دلدوز چیخ ماری اس نے اپنی
آخری طاقت سمیٹی اور ایک زوردار جھٹکے
سے اشفاق کی کلہاڑی ہوا میں ہی پکڑ لی لیکن
اس بار وہ اسے مار نہیں رہی تھی بلکہ اس
کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی
اشفاق روح کی آواز اب غصیلی نہیں بلکہ ایک
دردناک التجا تھی یہ تمہارے بھائی کی نشانی

ہیں کیا تم اتنے گر گئے ہو
اشفاق کے ہاتھ کانپنے لگے لیکن پیچھے سے
عامل کی آواز آئی رکو مت یہ اس کا فریب ہے
وار کرو
اشفاق نے دوبارہ زور لگایا لیکن اچانک حویلی
کی چھت سے ایک پرانا شہتیر ٹوٹ کر گرا
شہتیر سیدھا اشفاق اور اکرام کے درمیان گرا
جس نے انہیں بچوں سے دور کر دیا اسی
لمحے زینب کی روح نے ایک ایسا وار کیا کہ
بابا مہیب کا تانبے کا پیالہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور
اس کا کالا علم اس پر ہی الٹ گیا
عامل کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا اور وہ زمین
پر تڑپنے لگا نہیں یہ ممتا کا حصار ہے میں
اسے نہیں توڑ سکتا وہ اپنی جان بچانے کے لیے
حویلی سے باہر کی طرف بھاگا
اشفاق اور اکرام اندھیرے اور گرد و غبار میں
پھنس گئے تھے زینب کی روح اب بچوں کے
سامنے کھڑی تھی اس کی نظریں اپنے بھائیوں

پر جمی تھیں
آج تم بچ گئے اس کی آواز ایک سرد لہر کی طرح آئی لیکن کل جب سورج ڈھلے گا تو تمہارا اپنا سایہ تمہارا قاتل بن جائے گا

روشنی یکدم غائب ہوگئی جب اشفاق نے ٹارچ جلائی تو کمرہ خالی تھا بچے بیہوش پڑے تھے اور زینب کی روح غائب تھی لیکن دیوار پر خون سے ایک جملہ لکھا تھا تین دن صرف تین دن

اشفاق کی ٹارچ کی روشنی جب دیوار پر لکھے ان خونی الفاظ پر پڑی تو اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ کر فرش پر گر گئی تین دن یہ محض الفاظ نہیں تھے بلکہ موت کا وہ پروانہ تھا جس پر مہر لگ چکی تھی

اکرام جو شہتیر گرنے کی وجہ سے دیوار کے ساتھ پچھڑ گیا تھا ہذیانی انداز میں ہنسنے لگا بھائی جان وہ ہمیں مار دے گی وہ ہمیں نہیں چھوڑے گی دیکھو اس نے ہمیں مہلت دی ہے

تاکہ ہم اپنی موت کا تماشہ خود دیکھ سکیں
اکرام کی ذہنی حالت جواب دے رہی تھی اس
کا پٹی میں بندھا ہاتھ اب کالا پڑ چکا تھا
جیسے زہر رگوں میں اتر رہا ہو
اشفاق نے غصے سے اسے جھنجھوڑا چپ کر
کوئی نہیں مرے گا وہ عامل بھاگ گیا تو کیا
ہوا ہم شہر کے سب سے بڑے تانترک کے پاس
جائیں گے جائیداد ایسے ہی ہاتھ نہیں آتی اس
کے لیے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے
لیکن اشفاق کے اندر کا خوف اسے جھٹلا رہا
تھا کمرے میں پھیلی وہ مخصوص سڑاند اور
ٹھنڈک اب بھی موجود تھی اس نے بے ہوش
پڑے سیف اور سفیان کو دیکھا ان کے معصوم
چہروں پر خوف کے سائے اب بھی منجمد تھے
اشفاق کے ذہن میں ایک شیطانی خیال آیا
اگر یہ بچے حویلی سے باہر نکل جائیں تو وہ
روح بھی ان کے پیچھے جائے گی ہم انہیں
کسی دور دراز جنگل میں چھوڑ آئیں گے جہاں

نہ کوئی انسان ہو اور نہ ہی یہ واپس آ سکیں
اشفاق نے اکرام کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا
وہ دونوں دبے پاؤں بچوں کی طرف بڑھے
جوں ہی اشفاق نے سیف کو اٹھانے کے لیے
ہاتھ بڑھایا کمرے کی چھت سے ایک کالی
رنگت والی مائع ٹپکنے لگی اشفاق نے اوپر
دیکھا تو اس کی چیخ حلق میں پھنس گئی
چھت پر زینب کی روح الٹی لٹکی ہوئی تھی
اس کے بال مکڑی کے جالے کی طرح پورے
کمرے میں پھیل رہے تھے اس کا چہرہ بالکل
سفید تھا اور آنکھوں کی جگہ صرف دو گہرے
گڑھے تھے جن سے وہ کالا مائع بہ رہا تھا
میرے بچوں کو چھونے کی ہمت دوبارہ مت
کرنا روح کی آواز کسی قبر کی گہرائی سے
آتی محسوس ہوئی
اشفاق اور اکرام الٹے قدموں کمرے سے باہر
بھاگے وہ جیسے ہی دالان میں پہنچے حویلی
کا مرکزی دروازہ خود بخود بند ہوگیا اور اس

پر بڑے بڑے لوہے کے قفل تالے لگ گئے حالانکہ وہاں کوئی موجود نہیں تھا اب وہ اس حویلی میں قید ہو چکے تھے جہاں موت ان کا انتظار کر رہی تھی

رات کا دوسرا پہر شروع ہوا اشفاق نے خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور دروازے کے پیچھے بھاری الماری رکھ دی اس نے اپنے پاس ایک بندوق رکھ لی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ گولی روح کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی

اچانک کمرے کے کونے سے سرگوشیاں سنائی دینے لگیں

بھائی جان مجھے بچائیں بہت درد ہو رہا ہے

یہ چھوٹے بھائی عدنان کی آواز تھی

اشفاق کا سانس پھولنے لگا عدنان تم تو مر چکے ہو چلے جاؤ یہاں سے

آپ نے مجھے مارا بھائی جان وہ حادثہ نہیں تھا آپ نے میری گاڑی کی بریکیں فیل کی تھیں آواز اب دیواروں کے پیچھے سے آ رہی

تھی
اشفاق کے گناہوں کا دفتر کھل رہا تھا اسے یاد آیا کہ کیسے اس نے عدنان کی گاڑی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تھی تاکہ وہ راستے سے ہٹ جائے اچانک کمرے کی دیوار پر خون سے نقشے بننے لگے جو عدنان کی موت کے منظر کی عکاسی کر رہے تھے اشفاق نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن آوازیں بند نہ ہوئیں
دوسری طرف اکرام صحن میں اکیلا رہ گیا تھا وہ دیوانہ وار دروازہ پیٹ رہا تھا مجھے باہر نکالو میں جائیداد نہیں چاہتا مجھے بس جینا ہے
اچانک اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہے اس نے مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا لیکن فرش پر گیلے پاؤں کے نشان بن رہے تھے جو اس کی طرف بڑھ رہے تھے وہ نشان چھوٹے تھے جیسے کسی عورت کے ہوں اکرام پیچھے ہٹتے ہٹتے کنویں کے

پاس پہنچ گیا
نشانات کنویں کے منڈیر تک آکر رک گئے اکرام نے ہمت کر کے کنویں کے اندر جھانکا نیچے پانی کے بجائے اسے عکس نظر آیا لیکن وہ عکس اس کا نہیں تھا وہ زینب کا عکس تھا جو مسکرا رہی تھی اچانک کنویں سے دو سفید ہاتھ نکلے اور اکرام کی گردن کو جکڑ لیا نہیں زینب معاف کر دو اکرام کی آواز گھٹ گئی
اشفاق نے کمرے کے اندر اکرام کی دلدوز چیخ سنی اس نے الماری ہٹائی اور باہر بھاگا صحن میں اکرام غائب تھا صرف اس کی پٹی والا کپڑا کنویں کے پاس پڑا تھا اشفاق کنویں کی طرف بڑھا لیکن اس کے قدم رک گئے
آسمان پر بجلی کڑکی اور روشنی کے اس ایک لمحے میں اس نے دیکھا کہ حویلی کے برآمدے میں زینب کی روح بیٹھی سیف اور سفیان کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے بچے اب ہوش میں

تھے اور اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر پرسکون سو رہے تھے جیسے انہیں کسی بلا کا خوف نہ ہو

زینب نے سر اٹھا کر اشفاق کو دیکھا اس کی آنکھوں میں اب وہ وحشت نہیں تھی بلکہ ایک فاتحانہ سکون تھا اس نے اپنی ایک انگلی بلند کی اور دیوار پر لکھے الفاظ کی طرف اشارہ کیا

پہلا دن ختم ہوا اشفاق اب صرف دو دن باقی ہیں

اشفاق کے گھٹنے زمین پر ٹک گئے اسے احساس ہوا کہ وہ جس جائیداد کے لیے یہ سب کر رہا تھا وہ اب اس کی قبر بننے والی ہے حویلی کے در و دیوار سے قہقہے گونجنے لگے اور رات کا سیاہ لبادہ حویلی پر مزید گہرا ہو گیا

اشفاق کنویں کی منڈیر کے پاس منجمد کھڑا تھا اس کی نظریں اکرام کی اس خون آلود

پٹی پر جمی تھیں جو ہوا کے دوش پر کسی مردہ پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی اس نے ہمت کر کے کنویں کے اندر جھانکا لیکن وہاں صرف اتھاہ اندھیرا تھا اور پانی کی ایک گونجتی ہوئی آواز جیسے کوئی گہرائی میں سسکیاں بھر رہا ہو

اکرام بھائی اشفاق نے دہاڑ کر پکارا مگر جواب میں صرف اس کی اپنی آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس آئی

اچانک حویلی کے پرانے پیپل کے درخت پر بیٹھے الوؤں نے یک زبان ہو کر شور مچانا شروع کر دیا اشفاق مڑا تو اس نے دیکھا کہ صحن کے فرش پر پڑےہوئے پتھروں کے درمیان سے کالا دھواں رسنے لگا ہے وہ دھواں آہستہ آہستہ اوپر اٹھا اور انسانی شکل اختیار کرنے لگا اشفاق نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں زمین میں دھنس چکے ہیں

زینب کی روح اب اس کے عین سامنے تھی مگر اس کا وجود کسی جلے ہوئے کوئلے کی طرح سیاہ تھا جس کے اندر سے سرخ لکیریں دہک رہی تھیں اس نے اپنا ہاتھ اشفاق کے سینے کی طرف بڑھایا جیسے ہی اس کی انگلیاں اشفاق کے کرتے کو چھوئیں کپڑے سے دھواں اٹھنے لگا

لالچ کی آگ بہت تیز ہوتی ہے اشفاق روح کی آواز براہ راست اس کے دماغ میں گونجی تم نے جائیداد کے لیے اپنے بھائی کا خون کیا اب اس کنویں کی گہرائی دیکھو اکرام وہاں تمہارا انتظار کر رہا ہے

اشفاق نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا کنویں کے اندر سے اکرام کا ہاتھ باہر نکلا اس کی انگلیاں مٹی کو کھرچ رہی تھیں اکرام کا چہرہ پانی کی سطح سے ابھرا اس کی آنکھیں سفید ہو چکی تھیں اور وہ مسلسل ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا بھائی جان حصہ دے دیں جائیداد کا حصہ

دے دیں
اشفاق کی چیخ نکل گئی وہ دیوانہ وار بھاگا اور حویلی کے اس کمرے میں جا گھسا جہاں سیف اور سفیان سو رہے تھے اسے لگا کہ شاید بچوں کے پاس روح اسے نقصان نہیں پہنچائے گی کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ بچے گہری نیند میں ہیں لیکن ان کے گرد ایک نیلی روشنی کا ہالہ موجود تھا جو کسی ڈھال کی طرح چمک رہا تھا

جیسے ہی اشفاق اس ہالے کے قریب پہنچا اسے ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ دیوار سے جا ٹکرایا دیوار پر لگی عدنان کی تصویر فرش پر گری اور اس کا شیشہ چکنا چور ہو گیا اشفاق نے لرزتے ہاتھوں سے وہ تصویر اٹھائی تصویر میں عدنان مسکرا رہا تھا مگر اچانک تصویر کے اندر عدنان کی آنکھوں سے خون رسنے لگا اور اس کا چہرہ مسخ ہو کر زینب کے چہرے میں بدل گیا

نہیں یہ سب جھوٹ ہے میں نہیں ڈروں گا
اشفاق ہذیانی انداز میں چلایا اس نے الماری
سے وہ وصیت نکالی جس کے لیے اس نے یہ
سب کیا تھا اور اسے دانتوں سے پھاڑنے لگا یہ
لو مجھے نہیں چاہیے جائیداد مجھے جانے دو
اچانک کمرے کی کھڑکیاں ایک ساتھ کھلیں
اور پردے ناگنوں کی طرح لہرانے لگے زینب
کی روح اب کمرے کے وسط میں کھڑی تھی
اس نے اشفاق کی طرف قدم بڑھایا ہر قدم کے
ساتھ فرش پر برف جم رہی تھی
وصیت پھاڑنے سے گناہ نہیں مٹتے اس نے سرد
لہجے میں کہا تمہارا دوسرا دن شروع ہو چکا
ہے اشفاق آج رات تم اکیلے نہیں ہو گے تمہارے
گناہ مجسم ہو کر تمہارے پاس آئیں گے
روح نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور حویلی کے
تمام دروازے اور کھڑکیاں ایک ساتھ بجنے لگے
ایسا لگ رہا تھا جیسے سینکڑوں لوگ باہر
کھڑے دروازے توڑنے کی کوشش کر رہے ہوں

اشفاق نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے مگر آوازیں اس کے اندر سے آ رہی تھیں

سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے تک اشفاق اسی کمرے کے کونے میں دبکا رہا جب اجالا ہوا تو وحشت ناک مناظر غائب ہو چکے تھے مگر حویلی کا نقشہ بدل چکا تھا در و دیوار پر جابجا ناخنوں کے نشان تھے اور صحن میں موجود کنواں اب خشک ہو چکا تھا اور اس میں اکرام بے ہوش پڑا تھا کنوئیں اندر سے اکرام کی پٹی اب بھی باہر لٹک رہی تھی

اشفاق نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا اس کے بال راتوں رات سفید ہو چکے تھے اور چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں جیسے وہ ایک رات میں بیس سال بوڑھا ہو گیا ہو اس نے دیکھا کہ سیف اور سفیان جاگ چکے ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اسے دیکھ رہے ہیں ان کی آنکھوں میں اب تایا کے لیے کوئی ہمدردی نہیں تھی صرف ایک عجیب سا سکون تھا

جیسے وہ جانتے ہوں کہ ان کا محافظ اب ان کے ساتھ ہے

تایا ابو آپ رو کیوں رہے ہیں چھوٹے سفیان نے پوچھا مگر اس کی آواز میں وہ معصومیت نہیں تھی بلکہ ایک پراسرار گونج تھی

اشفاق نے جواب نہیں دیا اور گرتا پڑتا باہر کی طرف بھاگا مگر حویلی کی دیواریں اب اتنی بلند ہو چکی تھیں کہ اسے باہر کا آسمان بھی نظر نہیں آ رہا تھا

حویلی میں خوف کا راج اب اپنی انتہا کو چھو رہا تھا اشفاق اور اکرام کی حالت ایسی تھی جیسے وہ زندوں میں نہیں بلکہ مردوں میں شمار ہوتے ہوں اسی دوران اشفاق کی بیوی کلثوم جو اب تک خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی اپنے شوہر اور دیور کی جان بچانے کے لیے شہر سے ایک ایسی شخصیت کو لے آئی جس کا نام سن کر بڑے بڑے جنات لرزتے تھے سائیں بخش

سائیں بخش ایک طویل القامت بزرگ تھے جن
کی آنکھیں تسبیح کے دانوں کی طرح چمک
رہی تھیں انہوں نے حویلی کی دہلیز پر قدم
رکھتے ہی اپنی چھڑی زمین پر ماری یہاں
کسی عام روح کا سایہ نہیں یہاں تو ایک ممتا
تڑپ رہی ہے جس کا لہو اس حویلی کی
بنیادوں میں جذب ہے انہوں نے گرج دار آواز
میں کہا

روح کی حاضری اور سچائی کا انکشاف

سائیں بخش نے صحن کے وسط میں ایک
حصار کھینچا اور لوبان جلا کر زینب کی روح
کو حاضر ہونے کا حکم دیا فضا میں ایک دم
ٹھنڈک بڑھی اور زینب کی روح ایک لرزتے
ہوئے سائے کی صورت میں نمودار ہوئی سائیں
بخش نے اپنی روحانی طاقت سے اسے کلام
کرنے پر مجبور کیا

زینب کی روح کی سسکیاں پوری حویلی میں
گونجنے لگیں اس نے روتے ہوئے اپنی اپنے

شوہر کی موت اور اشفاق و اکرام کے ان مظالم کی داستان سنائی جنہوں نے اسے قبر سے واپس آنے پر مجبور کیا تھا سائیں بخش کا دل پسیج گیا مگر انہوں نے کہا بیٹی بدلہ لینا تمہارا حق ہے مگر تم اب اس جہان کی نہیں تمہیں ان معصوموں کی خاطر اب سکون اختیار کرنا ہوگا

سائیں بخش نے ایک پرانی چاندی کی ڈبیا نکالی اور خاص کلمات پڑھ کر زینب کی روح کو اس میں قید کر دیا اس کے بعد انہوں نے چمڑے کے چار تعویذ تیار کیے اور اشفاق اکرام اور کلثوم کے گلے میں ڈال دیے اور ایک انہیں پکڑا دیا

سائیں بخش نے سب کو مخاطب کر کے کہا یاد رکھنا جب تک یہ تعویذ تمہارے گلوں میں ہیں زینب کی روح تمہیں چھو بھی نہیں سکے گی لیکن یہ تعویذ صرف تمہاری ڈھال نہیں بلکہ اس کی قید کی چابی بھی ہیں اگر کسی

نے بھی یہ تعویذ اتارا تو زینب آزاد ہو کر اسی کے جسم میں داخل ہو جائے گی اور پھر اس کا غصہ کوئی نہیں روک پائے گا

اگلے ہی دن اشفاق کا اکلوتا بیٹا شہریار شہر سے تعلیم مکمل کر کے واپس آیا شہریار ایک جدید ذہن کا مالک سلجھا ہوا اور نیک دل نوجوان تھا اسے حویلی کا گھٹتا ہوا ماحول اور اپنے باپ کے گلے میں وہ عجیب و غریب تعویذ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی

ابا یہ کیا توہم پرستی ہے آپ سب نے یہ گلے میں کیا لٹکا رکھا ہے شہریار نے کھانے کی میز پر پوچھا

اشفاق نے اسے سختی سے ٹوکا شہریار تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے یہ ہماری زندگی کا سوال ہے اسے کبھی اتارنے کی کوشش مت کرنا

شہریار خاموش تو ہو گیا مگر اسے دال میں کچھ کالا محسوس ہوا اس نے دیکھا کہ اس کے معصوم کزن سیف اور سفیان سہمے ہوئے

ایک کونے میں بیٹھے ہیں اور ان کے تایا اشفاق انہیں نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں شہریار کے دل میں اپنے یتیم بھائیوں کے لیے بہت ہمدردی تھی اسے شک ہوا کہ اس کے والد اور چچا کچھ چھپا رہے ہیں اور یہ تعویذ کسی بڑے گناہ کی پردہ پوشی ہے

رات کا پچھلے پہر تھا حویلی میں ہر طرف سناٹا تھا مگر شہریار کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی وہ آئینے کے سامنے کھڑا اپنے گلے میں موجود اس سیاہ تعویذ کو دیکھ رہا تھا جو اس کے باپ نے اسے پہنایا تھا

کیسی عجیب بات ہے ایک پڑھے لکھے گھرانے میں ایسی خرافات اس نے سوچا شاید یہ تعویذ ہی ان سب کے وہم کی جڑ ہے اگر میں اسے اتار دوں تو سب کو احساس ہوگا کہ کچھ نہیں ہوتا

شہریار نے جیسے ہی اپنے ہاتھ تعویذ کی ڈور کی طرف بڑھائے حویلی کے پرانے گھڑیال نے

بارہ بجنے کا اعلان کیا جیسے ہی اس نے گرہ کھولی اور تعویذ میز پر رکھا
پورے گاؤں میں کتے رونے لگے وہ چاندی کی ڈبیا جو سائیں بخش نے تہہ خانے میں چھپائی تھی ایک زوردار دھماکے سے کھل گئی کمرے میں موجود کھڑکیاں خود بخود کھل گئیں اور ایک نیلا دھواں شہریار کے گرد رقص کرنے لگا شہریار کا جسم اکڑ گیا اور اس کی آنکھیں یکدم سفید ہو گئیں اسے محسوس ہوا جیسے کوئی طاقتور وجود اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے
کچھ لمحوں بعد شہریار نے آنکھیں کھولیں اب ان آنکھوں میں شہریار کی نرمی نہیں تھی بلکہ زینب کی وہ تڑپ اور بدلہ تھا جو برسوں سے دبا ہوا تھا اس کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ آئی جو شہریار کی نہیں تھی شہریار کا جسم کسی لکڑی کی طرح سخت ہو گیا تھا اس کے حلق سے ایک ایسی آواز نکلی

جو کسی انسان کی نہیں بلکہ کئی آوازوں کا مجموعہ تھی نیلے دھوئیں کے مرغولے اس کے مساموں میں جذب ہو رہے تھے اور اس کے ماتھے پر ابھرتی ہوئی نیلی رگیں صاف بتا رہی تھیں کہ اس کے وجود پر اب اس کا اپنا اختیار نہیں رہا

میز پر رکھا ہوا وہ تعویذ جسے شہریار نے محض ایک توہم سمجھ کر اتارا تھا اب کالا پڑ چکا تھا اور اس میں سے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح کوئی مادہ بہہ رہا تھا

شہریار یا اب کہنا چاہیے کہ زینب کی روح آہستہ قدموں سے کمرے سے باہر نکلی اس کے چلنے کا انداز بدل چکا تھا اس کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن جس جس جگہ سے وہ گزر رہا تھا وہاں لگی ہوئی تصویریں ٹیڑھی ہو رہی تھیں اور دیواروں کا پلاسٹر جھڑ کر گر رہا تھا

وہ سیدھا اپنے باپ اشفاق کے کمرے کی طرف

بڑھا اشفاق گہری نیند میں تھا لیکن اس کے
خواب ہولناک تھے اسے محسوس ہو رہا تھا
جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو اچانک
اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ شہریار
اس کے بیڈ کے سرہانے کھڑا اسے گھور رہا ہے
شہریار بیٹا تم اس وقت یہاں اشفاق نے ہڑبڑا
کر اٹھتے ہوئے پوچھا اس کی نظر شہریار کے
گلے پر پڑی جہاں اب تعویذ موجود نہیں تھا
تمہارا تمہارا تعویذ کہاں ہے
شہریار کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ آئی
جو اشفاق کا کلیجہ چیر گئی تعویذ تو وہ
پہنتے ہیں جنہیں موت کا خوف ہو شہریار کی
زبان سے زینب کی آواز نکلی
اشفاق کی روح فنا ہو گئی زینب تم تم میرے
بیٹے کے جسم میں
شہریار نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور اشفاق
کا جسم خود بخود بیڈ سے اچھل کر دیوار کے
ساتھ جا لگا تم نے میرے شوہر کو مارا مجھے

زہر دیا اور میرے معصوم بچوں سیف اور سفیان کو تڑپایا اب بولو تمہارا وہ عامل کہاں ہے تمہارا وہ تعویذ کہاں ہے

اشفاق نے اپنے گلے میں موجود تعویذ کو زور سے پکڑا لیکن اسے محسوس ہوا کہ وہ تعویذ اب دہکتا ہوا کوئلہ بن چکا ہے اس کے گلے سے گوشت جلنے کی بو آنے لگی وہ چیخنا چاہتا تھا مگر اس کی آواز غائب ہو چکی تھی

دوسری طرف اکرام جو دوسرے کمرے میں سو رہا تھا اسے صحن میں کسی کے رونے کی آواز آئی وہ ڈرتا ہوا باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ صحن کے وسط میں شہریار کھڑا ہے لیکن اس کے بال غیر قدرتی طور پر لمبے ہو چکے تھے اور وہ زمین سے چند انچ اوپر معلق تھا

شہریار یہ کیا تماشہ ہے اکرام چلایا

شہریار مڑا اور اس کی سفید آنکھوں نے اکرام کو ساکت کر دیا حصہ چاہیے تھا نہ تمہیں جائیداد کا حصہ

اچانک حویلی کا فرش اکرام کے پیروں تلے سے پھٹنے لگا اکرام کو ایسا لگا جیسے زمین اسے نگل رہی ہو وہ جتنا بچنے کی کوشش کرتا مٹی اسے اتنا ہی نیچے کھینچتی بھائی جان بچائیں اکرام نے دہائی دی لیکن اشفاق خود موت و زندگی کی کشمکش میں تھا

زینب کی روح نے شہریار کے ہاتھوں سے ایک اشارہ کیا اور اکرام کا وہ ہاتھ جس پر گھوڑے نے لات ماری تھی خود بخود مڑنے لگا یہاں تک کہ ہڈیاں ٹوٹنے کی آوازیں پورے دالان میں گونجنے لگیں

اس سارے شور و غل میں سیف اور سفیان کی آنکھ کھل گئی وہ سہمے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلے تو سامنے کا منظر دیکھ کر ساکت رہ گئے ان کا بڑا بھائی شہریار ہوا میں معلق تھا اور تایا و چچا فرش پر تڑپ رہے تھے شہریار بھیا چھوٹے سفیان نے ڈرتے ہوئے پکارا شہریار زینب کی روح کا رخ فوراً بچوں کی

طرف ہوا اس کے چہرے کی وحشت ایک دم
ختم ہو گئی اور وہاں وہی ممتا بھری نرمی آ
گئی جو زینب کی پہچان تھی
میرے بچو ڈرو مت روح نے شہریار کے لبوں
سے کہا آج کے بعد تمہیں کوئی نہیں رلائے گا
آج اس حویلی سے ناانصافی کا سورج ہمیشہ
کے لیے غروب ہو جائے گا
زینب کی روح نے اپنی طاقت سے اشفاق اور
اکرام کو ایک کونے میں پٹخ دیا جہاں وہ ادھ
موئی حالت میں پڑے تھے روح نے شہریار کے
شعور کو مخاطب کیا شہریار تم ایک نیک دل
انسان ہو
حویلی کے دالان میں پھیلی وہ نیلی روشنی
اب شہریار کے جسم کے گرد ایک حصار کی
صورت اختیار کر چکی تھی اشفاق اور اکرام
جو اپنے گناہوں کے بوجھ تلے پہلے ہی دبے
ہوئے تھے اب اپنے ہی خون اپنے ہی بیٹے کے
سامنے بے بس کھڑے تھے شہریار کی آنکھیں

جو کبھی شفقت اور تہذیب کا آئینہ دار تھیں
اب ان میں ایک قدیم اور گہرا انتقام لہریں لے
رہا تھا
ابا آپ نے کہا تھا کہ یہ تعویذ میری زندگی ہے
شہریار کے حلق سے نکلنے والی آواز اب مکمل
طور پر زینب کی گونج دار آواز بن چکی تھی
لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ میری ماں
جیسی چاچی کی روح کی زنجیر ہے آپ نے
اپنی جان بچانے کے لیے اس ممتا کو قید کیا
جس نے آپ کے بھائی کے گھر کو آباد کیا تھا
اشفاق نے کپکپاتے ہاتھوں سے دیوار کا سہارا
لیا شہریار بیٹا میری بات سنو وہ روح تمہیں
بہکا رہی ہے
خاموش شہریار کی ایک دہاڑ نے حویلی کی
چھت سے مٹی جھاڑ دی بہکاوہ وہ تھا جو آپ
نے دنیا کو دیا کہ زینب صدمے سے مر گئی سچ
تو وہ ہے جو اس حویلی کی ہر اینٹ چیخ
چیخ کر کہہ رہی ہے

اچانک شہریار نے اپنا ہاتھ اکرام کی طرف بڑھایا اکرام کا جسم خود بخود زمین سے ایک فٹ اوپر اٹھ گیا چچا آپ کو جائیداد کا بہت شوق تھا نہ نہر کنارے والے وہ باغات آپ کو بہت عزیز تھے اکرام کا گلا گھٹنے لگا اور اس کی آنکھیں باہر کو ابلنے لگیں

آج سے وہ باغات تمہارے لیے نہیں بلکہ ان یتیموں کے لیے وقف ہوں گے جن کا نوالہ تم نے چھینا روح نے شہریار کے ذریعے حکم صادر کیا

اشفاق کی بیوی کلثوم جو اب تک سجدے میں پڑی رو رہی تھی دوڑ کر شہریار کے قدموں میں گر گئی زینب میری بہن میرے بیٹے کو چھوڑ دے اس کا کوئی قصور نہیں ہے اشفاق اور اکرام نے جو کیا اس کی سزا مجھے دے دے مگر میرے جوان بیٹے کو اس آگ میں مت جلا

شہریار زینب کی روح کی نظریں کلثوم پر

پڑیں غصے کی تپش میں تھوڑی سی نرمی آئی کلثوم تم نے ہمیشہ خاموشی سے اس ظلم کو دیکھا مگر تم نے کبھی میرے بچوں کو نقصان نہیں پہنچایا تمہارے آنسوؤں نے شہریار کو بچا لیا ورنہ آج اس حویلی میں صرف لاشیں ہوتیں

روح نے شہریار کے جسم سے ایک تیز روشنی خارج کی جس نے اشفاق اور اکرام کو دور صحن کے کونے میں پٹخ دیا ان کے گلے میں موجود تعویذ خود بخود ٹوٹ کر راکھ بن گئے ان کی طاقت ان کا رعب اور ان کا غرور اب خاک میں مل چکا تھا وہ دونوں ادھ موئی حالت میں زمین پر رینگ رہے تھے ان کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں

کچھ لمحوں بعد وہ نیلا دھواں شہریار کے وجود سے نکل کر ہوا میں بکھر گیا اور شہریار بے ہوش ہو کر گر پڑا فضا میں ایک آخری بار زینب کی وہی میٹھی لوری سنائی دی جو اب

الوداعی دعا لگ رہی تھی
جب صبح کی پہلی کرن نے حویلی کے صحن کو چھوا تو شہریار کو ہوش آیا اس کے سامنے اس کے باپ اور چچا ذلیل و خوار پڑے تھے اور برابر میں سیف اور سفیان اسے حیرت اور امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے
شہریار اٹھا اس نے اپنے کپڑے جھاڑے اور سب سے پہلے سیف اور سفیان کو گلے سے لگایا بھائی اب ڈرنے کی ضرورت نہیں یہ حویلی اب قید خانہ نہیں بلکہ ایک پناہ گاہ بنے گی
اس نے اپنے باپ اشفاق کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں اب صرف شرمندگی تھی ابا آپ نے جائیداد کے لیے اپنا ایمان بیچا اب میں اس جائیداد سے انسانوں کی جان بچاؤں گا
شہریار نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ وہ شہر سے اپنا تمام سرمایہ واپس لائے گا اور اس منحوس کہلانے والی حویلی کے ایک بڑے

حصے کو زینب میموریل ہسپتال میں تبدیل کر دے گا جہاں گاؤں کے غریبوں کا مفت علاج ہوگا نہر کنارے والے باغات سے ہونے والی تمام آمدنی سیف اور سفیان کے نام ہوگی اور وہ ان دونوں کو اپنے بچوں کی طرح پالے گا

شہریار نے اپنا وعدہ پورا کیا اشفاق اور اکرام کو اس نے پولیس کے حوالے نہیں کیا لیکن ان کی سزا یہ تھی کہ وہ اسی ہسپتال میں خدمت گزار بن کر رہے جہاں وہ ہر روز ان لوگوں کی دعا لیتے جنہیں کبھی وہ حقیر سمجھتے تھے زینب کی روح اب حویلی میں نہیں بھٹکتی تھی کیونکہ اسے انصاف مل چکا تھا اور اس کے بچے ایک ایسے محافظ کے سائے میں تھے جس نے خون کے رشتوں کو دوبارہ معتبر بنا دیا تھا

اختتام



کہانی: بیس سال بعد

ازقلم:کامی

جون کا مہینہ تھا اور سورج آگ برسا رہا تھا۔ علی،حسن اور حیدر نے فیصلہ کیا کہ اس حبس سے بچنے کے لیے ایبٹ آباد سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔یہی سوچ کر تینوں دوست گھومنے پھرنے کے ارادے سے ایبٹ آباد روانہ ہوئے

حسن جو ان کا سب سے عقل مند اور پرسکون دوست مانا جاتا تھا، گاڑی چلا رہا تھا۔

"یار حسن، ذرا گاڑی تیز چلاؤ! میرا دل ابھی سے وہاں کے مشہور پکوڑوں میں اٹکا ہوا ہے،" علی نے سیٹ پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

ایبٹ آباد پہنچتے ہی انہوں نے سب سے پہلے الیاسی مسجد کا رخ کیا۔پہاڑکے دامن میں سفید سنگِ مرمر سے بنی یہ مسج ایسی لگ رہی تھی جیسے کوئی خواب۔ مسجد کے چشمے کا ٹھنڈا پانی پیتے ہی ان کی ساری تھکن اتر گئی۔

"اب باری ہے یہاں کے مشہور پکوڑوں کی!" حیدر نے جوش سے کہا۔

انہوں نے مسجد کے باہر گرم گرم پکوڑے کھائے جن کی خوشبو پورے ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن جیسے ہی شام ڈھلی، ان کی پریشانی شروع ہو گئی۔ انہوں نے شہر کے درجنوں ہوٹل چھان مارے، لیکن کہیں بھی

جگہ نہیں تھی۔ ہر طرف سیاحوں کا رش تھا۔
"اب کیا کریں گے؟ گاڑی میں تو رات نہیں گزاری جا سکتی،" حیدر نے فکر مندی سے کہا۔
تبھی ایک مقامی ٹیکسی والے نے انہیں مشورہ دیا: "صاحب، اگر آپ کو ڈر نہ لگے تو شملہ پہاڑی کے اوپر ایک پرانی رہائش گاہ ہے۔ مالک باہر ہوتے ہیں، بس ایک بوڑھا چوکیدار وہاں رہتا ہے۔ وہ اکثر مسافروں کو کمرہ دے دیتا ہے۔"
تھکن سے چور تینوں دوستوں نے فوراً ہامی بھر لی۔
شملہ پہاڑی کی چڑھائی چڑھتے ہوئے حسن کو محسوس ہوا کہ ہوا اچانک بہت ٹھنڈی اور بوجھل ہو گئی ہے۔ جیسے جیسے وہ اوپر جا رہے تھے، شہر کی روشنیاں نیچے چھوٹتی جا رہی تھیں اور گھنا اندھیرا انہیں اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔
اچانک، سڑک کے آخری موڑ پر وہ پتھروں سے

بنی حویلی نما گھر نمودار ہوا۔ اس کے سامنے ایک بوڑھا آدمی لالٹین لیے کھڑا تھا، جیسے اسے معلوم ہو کہ آج کوئی مہمان آنے والا ہے بوڑھے چوکیدار کی لالٹین کی زرد روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، جس سے اس کی جھریاں کسی گہری کھائی کی طرح لگ رہی تھیں۔ اس نے ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ گیٹ کھولا اور اپنی گردن کو ایک طرف جھکا کر بولا، "آ جاؤ، آ جاؤ... شملہ پہاڑی پر آج بہت عرصے بعد تازہ خون... میرا مطلب ہے تازہ مہمان آئے ہیں۔"

حسن نے گاڑی اندر داخل کی تو ٹائروں کے نیچے سوکھے پتوں کے کچلے جانے کی آواز پورے سنسان ماحول میں گونجنے لگی۔ گاڑی کھڑی کر کے جیسے ہی وہ تینوں باہر نکلے، علی کو ایک دم ٹھنڈ کا احساس ہوا۔

"یار حسن، ایبٹ آباد میں اتنی ٹھنڈ تو نہیں تھی جتنی اس گھر کے پاس ہے،" علی نے اپنی

باہیں سکیڑتے ہوئے کہا۔
حیدر نے حویلی کی بلندی کو دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا، "بھئی، جگہ تو کمال کی ہے، پر یہاں کوئی اور مہمان کیوں نہیں ہے؟"
بوڑھا چوکیدار ان کے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کے قدموں کی آواز بالکل نہیں آ رہی تھی، صرف اس کی لالٹین کی زنجیر کے ہلنے کی "چخ چخ" سنائی دے رہی تھی۔ وہ انہیں ایک بڑے سے ہال میں لے آیا۔ ہال کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا لکڑی کا دسترخوان بچھا تھا، جس پر پانچ پلیٹیں لگی تھیں، جیسے کوئی ابھی کھانا کھا کر اٹھا ہو۔
"یہ لو چابی،" بوڑھے نے ایک بھاری پیتل کی چابی حسن کے ہاتھ میں تھمائی۔ "اوپر کا کمرہ تمہارا ہے۔ بس ایک بات یاد رکھنا، رات کو اگر دیواروں سے رونے کی آواز آئے، تو کان بند کر لینا، اور اگر کوئی دستک دے... تو سوچے سمجھے بغیر دروازہ مت کھولنا۔"

بوڑھا یہ کہہ کر ایک اندھیرے کونے میں مڑ گیا

تینوں دوست اوپر کے کمرے میں پہنچے۔ کمرہ کافی بڑا تھا لیکن وہاں کی ہوا بہت بوجھل تھی۔ حسن نے کھڑکی کھولی تو دور نیچے ایبٹ آباد کی روشنیاں اور مسجد کے مینار دھندلے سے نظر آ رہے تھے۔

"کتنا عجیب ہے نا،" حسن نے سوچتے ہوئے کہا، "کچھ گھنٹے پہلے ہم وہاں مشہور پکوڑے کھا رہے تھے اور اب اس ویران جگہ پر ہیں۔"

رات کے دو بجے، جب سب گہری نیند میں تھے، اچانک پورے گھر میں ایک زوردار دھماکا ہوا، جیسے کسی نے بہت بھاری چیز فرش پر پٹخ دی ہو۔

تینوں ہڑبڑا کر اٹھے۔ کمرے کی دیواروں پر لگی پرانی تصویریں خود بخود ہلنے لگیں۔ اچانک، فرش کے نیچے سے ایک دھیمی سی آواز آنے لگی، جیسے کوئی زمین کے اندر سے

بول رہا ہو۔
"ہمیں پیاس لگی ہے... ہمیں انصاف چاہیے..."
دروازے پر دستک ہوئی: ٹک... ٹک... ٹک...
علی دروازے کی طرف لپکا لیکن حسن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "رک جاؤ! بوڑھے نے کیا کہا تھا یاد ہے؟"
باہر سے ایک بھاری، مردانہ آواز آئی جو غصے اور درد میں ڈوبی ہوئی تھی:
"بیس سال پہلے، ہم اسی دسترخوان پر بیٹھے تھے جہاں تم ابھی گزر کر آئے۔ ہم نے وہ مشروب پیا جو زندگی دیتا ہے، لیکن ہمیں موت مل گئی۔ وہ پیالہ آج بھی وہیں ہے، لیکن اس کا رنگ بدل چکا ہے۔ بتاؤ، وہ کیا تھا جس نے ہمیں مار دیا، جبکہ ہم نے اسے شفا سمجھ کر پیا تھا؟"
حسن کا ماتھا پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ کوئی عام مذاق نہیں ہے۔ یہ ان پانچ روحوں کا پہلا سوال تھا جو انصاف

مانگ رہی تھیں۔
"اگر جواب نہ دیا تو کیا ہوگا؟" حیدر نے کانپتی آواز میں پوچھا۔
جواب میں دروازے کے نیچے سے خون کا ایک ریلا اندر آنے لگا اور کمرے کا درجہ حرارت اتنا گر گیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے۔ روحوں کا سایہ دیوار پر واضح ہونے لگا، جن کے ہاتھوں کی انگلیوں پر خنجر نما ناخن تھے
حسن نے اپنی بند آنکھوں کے پیچھے اس منظر کو دہرانے کی کوشش کی جو اس نے ہال میں داخل ہوتے وقت دیکھا تھا۔ وہ پرانا دسترخوان، وہ پانچ پلیٹیں اور ان کے درمیان رکھا وہ عجیب و غریب پیتل کا پیالہ۔
حیدر اور علی کی سانسیں حلق میں اٹکی ہوئی تھیں۔ کمرے کی دیواریں اب آہستہ آہستہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں، جیسے وہ انہیں کچلنا چاہتی ہوں۔ باہر سے آنے والی آواز اب چیخ میں بدل رہی تھی:

"بتاؤ! وہ کیا تھا؟ ہماری سانسیں اکھڑ رہی ہیں، ہمیں جواب دو ورنہ ہم تمہاری سانسیں چھین لیں گے!"

حسن کا ذہن بجلی کی تیزی سے گھوما۔ اس نے سوچا، "ایبٹ آباد کی ٹھنڈ، پہاڑی علاقہ، بیس سال پہلے کی بات... شفا سمجھ کر پیا جانے والا مشروب جو موت بن گیا؟"

اچانک اس کے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا۔ اس نے ہمت جمع کی اور بلند آواز میں دروازے کی طرف دیکھ کر کہا:

"وہ پارہ **(Mercury)** تھا! تم نے اسے شفا بخش کشتہ سمجھ کر پیا، لیکن وہ زہر بن چکا تھا!"

ایک لمحے کے لیے قبر جیسی خاموشی چھا گئی۔ پھر، ایک دلدوز چیخ سنائی دی جیسے کوئی ہوا میں تحلیل ہو رہا ہو۔ دروازے کے نیچے سے بہتا ہوا خون غائب ہو گیا اور درجہ حرارت نارمل ہونے لگا۔

بچ گئے"
علی وہیں فرش پر ڈھیر ہو گیا، اس کا سانس پھول رہا تھا اور پیشانی پسینے سے شرابور تھی۔ حیدر نے لپک کر اسے سہارا دیا، جبکہ حسن کی نظریں ابھی بھی اس بند دروازے پر جمی تھیں جہاں سے ابھی ابھی وہ ہولناک آواز آئی تھی۔
"بھائی، یہ کیا بلا تھی؟" حیدر نے کانپتی آواز میں پوچھا۔ "ہم یہاں سیر کرنے آئے تھے یا اپنی موت کو دعوت دینے؟"
حسن نے گہرا سانس لیا اور اپنے کپکپاتے ہاتھوں کو مٹھیوں میں بھینچ لیا۔ "خاموش رہو حیدر! اگر ہم نے ہمت ہاری تو یہ دیواریں ہمیں زندہ نگل لیں گی۔ ہمیں نیچے جانا ہوگا، اس بوڑھے چوکیدار کو ڈھونڈنا ہوگا۔ وہی جانتا ہے کہ اس گھر کا اصل راز کیا ہے۔"
وہ تینوں کمرے سے باہر نکلے تو راہداری کا منظر بدل چکا تھا۔ وہ لالٹین جو چوکیدار کے

ہاتھ میں تھی، اب دیوار پر لٹکی جل رہی تھی، لیکن اس کی روشنی زرد نہیں بلکہ گہری نیلی تھی۔ سیڑھیاں جو پہلے لکڑی کی تھیں، اب ایسی لگ رہی تھیں جیسے پرانی ہڈیوں سے بنی ہوں۔

جیسے ہی انہوں نے پہلا قدم نیچے رکھا، پوری حویلی لرزنے لگی۔ دیواروں پر لگی تصویروں میں موجود وہ فیملی اب مسکرا نہیں رہی تھی، بلکہ ان کے چہرے غصے سے بگڑ چکے تھے۔ ان کی آنکھوں سے سیاہ رنگ کا مادہ بہہ رہا تھا۔

"رک جاؤ!" حسن نے اچانک سب کو روکا۔

سیڑھیوں کے بالکل بیچ میں وہی بوڑھا چوکیدار بیٹھا تھا، لیکن اب اس کا چہرہ انسانی نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی کھال لٹک رہی تھی اور وہ اپنی انگلیوں سے فرش پر کچھ لکیریں کھینچ رہا تھا۔

بوڑھے نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں بالکل

سفید تھیں۔ اس نے ایک عجیب و غریب لہجے میں کہا:
"تم نے پہلی دیوار تو پار کر لی، لیکن کیا تم اس 'پیاس' کو بجھا سکتے ہو جو بیس سال سے ادھوری ہے؟"
اس نے اپنی انگلی سے نیچے ہال کے دسترخوان کی طرف اشارہ کیا جہاں اب پانچوں سائے بیٹھ چکے تھے۔ ان کے سامنے رکھی پلیٹوں سے اب وہی مہک آ رہی تھی جو پکوڑوں کی دکان سے آ رہی تھی۔ لیکن جب حسن نے غور سے دیکھا تو وہ پکوڑے نہیں تھے، بلکہ انسان کی ٹوٹی ہوئی انگلیاں تھیں جو تلی ہوئی تھیں۔
بوڑھے نے دوسری پہیلی پھینکی:
"ہم پانچوں اس دسترخوان پر بیٹھے تھے، مگر ہم میں سے ایک ایسا تھا جس کے پاس اپنا کوئی جسم نہیں تھا، پھر بھی اس نے سب سے زیادہ کھانا کھایا۔ اس نے ہمیں ایک

دوسرے کا گوشت کھلایا اور وہ آج بھی اسی کمرے میں موجود ہے۔ بتاؤ وہ کون تھا؟"
علی نے گھبرا کر حسن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "حسن، یہ تو کہہ رہا ہے کہ ہم میں سے ہی کوئی..."
حسن نے ٹھنڈے دماغ سے سوچا۔ اس نے علی اور حیدر کے چہروں کو دیکھا، پھر ان پانچ سایوں کو۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ مسجد کے باہر پکوڑے کھا رہے تھے، تو وہاں ایک فقیر نے انہیں ٹوکا تھا کہ "اجنبیوں کے ساتھ دسترخوان شیئر مت کرنا"۔
حسن نے ہمت جمع کی اور بلند آواز میں کہا:
"وہ 'شک' **(Suspicion)** تھا! شک کا اپنا کوئی جسم نہیں ہوتا، لیکن وہ انسان کو اندر سے کھا جاتا ہے۔ تم پانچوں نے ایک دوسرے پر شک کیا کہ کوئی ایک قاتل ہے، اور اسی شک نے تم سب کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا کر دیا!"
جیسے ہی حسن نے یہ الفاظ کہے، پورے ہال

میں ایک زوردار دھماکا ہوا اور بوڑھا چوکیدار ایک سیاہ دھوئیں میں بدل کر غائب ہو گیا۔ سیڑھیاں اپنی اصل حالت میں واپس آگئیں اور وہ نیلی روشنی غائب ہو گئی۔

"ہم جیت گئے؟" حیدر نے ہانپتے ہوئے پوچھا

حسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں... ابھی تو صرف دو دیواریں گری ہیں۔ وہ فیملی ابھی بھی وہیں بیٹھی ہے اور ان کی نظریں اب ہماری طرف ہیں۔"

ابھی حسن کی بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ حویلی کا بھاری لکڑی کا مرکزی دروازہ خود بخود کھل گیا اور باہر سے پہاڑی ہوا کا ایک سرد جھونکا اندر داخل ہوا۔ لیکن یہ ہوا عام نہیں تھی، اس میں ایبٹ آباد کی مٹی کی وہ مانوس خوشبو تھی جو بارش کے بعد آتی ہے، مگر اس میں سڑاند کی ایک لہر بھی شامل تھی۔

"دروازہ کھل گیا! چلو بھاگتے ہیں!" علی نے

چیخ کر کہا اور سیڑھیوں سے نیچے کی طرف دوڑا۔

حیدر اور حسن بھی اس کے پیچھے لپکے۔

جیسے ہی وہ ہال سے گزرے، ان کی نظر اس دسترخوان پر پڑی۔ اب وہاں رکھی پلیٹیں خالی تھیں، لیکن ان پر خون سے پانچ نام لکھے ہوئے تھے۔ تین نام اس فیملی کے تھے اور دو نام... علی اور حیدر کے تھے۔

"میرا نام... میرا نام یہاں کیسے آیا؟" حیدر کے قدم وہیں جم گئے۔

"یہ سب وہم ہے، حیدر! پیچھے مت دیکھو، بس باہر نکلو!" حسن نے اسے جھنجھوڑا اور دھکا دے کر باہر کی طرف نکالا۔

لیکن جیسے ہی وہ حویلی کے صحن میں پہنچے، ان کے ہوش اڑ گئے۔ باہر کوئی سڑک نہیں تھی، کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہاں صرف ایک پرانا، اجاڑ باغ تھا جس کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا بیری کا درخت تھا۔ اس درخت

کی شاخیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے کوئی بوڑھی عورت اپنے سوکھے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہو۔

درخت کے نیچے تین چھوٹے چھوٹے سائے کھیل رہے تھے۔ یہ وہی بچے تھے جن کی تصویر انہوں نے اندر دیکھی تھی۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گھوم رہے تھے اور ایک عجیب سی لوری گا رہے تھے:

"کھودو زمین، پاؤ ہمیں... جو سچ کہے گا، گھر جائے گا..."

اچانک وہ بچے رک گئے اور ان کا رخ حسن، علی اور حیدر کی طرف ہو گیا۔ ان کے چہروں پر آنکھیں نہیں تھیں، صرف سیاہ گڑھے تھے۔ سب سے چھوٹے بچے نے ایک ٹوٹی ہوئی آواز میں تیسری پہیلی پوچی:

"ہم تینوں اس درخت کے نیچے سو رہے ہیں، لیکن ہماری نیند کچی ہے۔ ہم سے پہلے وہ مرا جو ہمیں بچانے آیا تھا، اور ہمارے بعد وہ مرا

جس نے ہمیں مارا تھا۔ بتاؤ، وہ کون سی چیز ہے جو قاتل کے ہاتھ میں تھی، مقتول کے دل میں تھی، اور اب تمہارے قدموں کے نیچے ہے؟"
علی خوف کے مارے زمین پر بیٹھ گیا اور کلمہ پڑھنے لگا۔ حیدر نے اپنے جوتوں کے نیچے دیکھا، وہاں صرف خشک پتے اور مٹی تھی۔
حسن نے بیری کے درخت کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑگیا پھر اچانک اسے یاد آیا کہ پکوڑوں کی دوکان والے بزرگ نے کہا تھا کہ "شملہ پہاڑی کی مٹی بہت کچھ نگل لیتی ہے، خاص کر وہ جو لالچ کی بھینٹ چڑھ جائے"۔
حسن کی نظر اچانک درخت کی جڑ میں دبی ایک زنگ آلود دھاتی چیز پر پڑی۔ اس نے مٹی ہٹائی تو وہاں ایک پرانی چابی پڑی تھی جس پر خون کے نشانات اب بھی باقی تھے۔
"وہ 'وفاداری' **(Loyalty)** ہے! قاتل کے ہاتھ میں وہ چابی تھی جو اس نے وفاداری توڑ کر حاصل کی، مقتول کے دل میں وفاداری تھی

جس نے اسے دھوکہ دیا، اور اب یہ چابی
ہمارے قدموں میں دبی ہے!"
جیسے ہی حسن نے یہ جواب دیا، بیری کا
درخت زور سے لرزا اور ان تینوں بچوں کے
سائے مٹی میں جذب ہو گئے۔ فضا میں ایک
سکون سا چھا گیا، لیکن یہ سکون عارضی تھا۔
دور پہاڑی کی چوٹی سے وہی بوڑھے چوکیدار
کا قہقہہ گونجا:
"ابھی تو آدھی رات باقی ہے شہزادو! ابھی تو
تمہیں اس 'ماں' سے ملنا ہے جس کی ممتا اب
نفرت بن چکی ہے۔"
حسن نے دیکھا کہ ان کے سامنے والی مٹی اب
ابھر رہی تھی، جیسے کوئی اندر سے باہر نکلنے
کی کوشش کر رہا ہو
مٹی میں ارتعاش بڑھتا جا رہا تھا، جیسے
زمین کے نیچے کوئی بہت بڑی چیز کروٹ بدل
رہی ہو۔ حسن، علی اور حیدر پیچھے ہٹتے
ہٹتے اس پرانے بیری کے درخت کے تنے سے جا

لگے۔ درخت کی خشک شاخیں ان کے سروں پر کسی ڈھانچے کی انگلیوں کی طرح جھک رہی تھیں۔
اچانک، مٹی پھٹی اور ایک عورت کا ہیبت ناک سایہ نمودار ہوا۔ اس کا سفید لباس مٹی اور خون سے اٹا ہوا تھا اور بال زمین تک بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر آنکھیں نہیں تھیں، لیکن اس کی چیخ میں اتنی شدت تھی کہ پہاڑی کے دور دراز درختوں پر بیٹھے پرندے پھڑپھڑا کر اڑنے لگے۔
عورت کے سائے نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا تو باغ کے چاروں طرف ایک نادیدگی دیوار کھڑی ہو گئی۔ اب نہ وہ حویلی میں واپس جا سکتے تھے اور نہ ہی گیٹ کی طرف۔
"تم نے میرے بچوں کو خاموش کر دیا؟" عورت کی آواز میں ایک ایسی تھرتھراہٹ تھی جیسے برفانی ہوا چل رہی ہو۔ "لیکن میری تڑپ کا حساب کون دے گا؟ بیس سال سے

میں اس مٹی میں دبی اس انصاف کا انتظار کر رہی ہوں جو کبھی ایبٹ آباد کی کچہریوں سے یہاں تک نہیں پہنچا!"

حیدر نے ہمت جمع کی اور چلایا، "ہمیں معاف کر دیں! ہم تو بس مسافر ہیں، ہمیں تو صرف ایک رات گزارنی تھی!"

عورت کا سایہ اچانک حیدر کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی سانسوںسے مردہ پھولوں جیسی بو آ رہی تھی۔

"مسافر ہی تو ہوتے ہیں جو خبر لاتے ہیں،" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو، تو میری چوتھی پہیلی کا جواب دو۔"

چوتھی پہیلی: ادھورا سچ

اس نے اپنے ہاتھ میں ایک پرانی، ٹوٹی ہوئی چوڑی اٹھائی جو مٹی میں دبی ہوئی تھی۔

"میں نے اسے اپنی کلائی سے اتارا تاکہ اس کی آواز کسی کو نہ سنائی دے۔ میں نے اسے اس کے حوالے کیا جس پر مجھے سب سے زیادہ

مان تھا۔ اس نے اسے بیچا نہیں، بلکہ اسے ایک ایسی جگہ چھپایا جہاں روشنی کبھی نہیں پہنچتی۔ بتاؤ، وہ کون تھا جس نے میری ممتا کا سودا کیا اور وہ چیز اب کہاں ہے؟"

علی نے گھبراتے ہوئے حسن کی طرف دیکھا۔

"حسن بھائی، یہ تو کسی غداری کی بات کر رہی ہے۔ ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ بیس سال پہلے یہاں کیا ہوا تھا؟"

حسن نے اپنی آنکھیں بند کیں اور ماضی کے ان دھندلے نقوش کو جوڑنے کی کوشش کی جو اس نے حویلی کے اندر اخبار کے تراشوں اور تصویروں میں دیکھے تھے۔ اسے یاد آیا کہ اخبار میں لکھا تھا کہ "گھر کا ملازم غائب ہے"۔

حسن کی نظر اچانک باغ کے کونے میں بنے اس پرانے کنویں پر پڑی جس پر پتھر رکھ کر اسے بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے بلند آواز میں جواب دیا:

"وہ تمہارا اپنا وفادار ملازم تھا، جسے تم نے

بچوں کی حفاظت کے لیے زیور دیا تھا! لیکن اس نے وہ چوڑی بیچی نہیں بلکہ اسی کنویں میں پھینک دی تاکہ تمہارا قاتل اسے ڈھونڈ نہ سکے اور وہ خود بھی وہیں مارا گیا!"

جواب سنتے ہی عورت کا سایہ ساکت ہو گیا۔ پھر اچانک وہ کنویں کی طرف مڑی اور ایک لمبی، دردناک آہ بھری۔ کنویں پر رکھا بھاری پتھر خود بخود ہٹ گیا اور اندر سے ایک زرد روشنی نکلنے لگی۔

"تم نے آدھا سچ پا لیا ہے،" عورت نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ "لیکن ابھی وہ 'قاتل' باقی ہے جو تمہارے درمیان چھپا بیٹھا ہے۔"

حسن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے علی اور حیدر کی طرف دیکھا۔ کیا ان میں سے کوئی بدل چکا تھا؟ یا وہ بوڑھا چوکیدار اب بھی ان کا پیچھا کر رہا تھا؟

شملہ پہاڑی کی فضا اب مزید بوجھل ہو رہی تھی۔ دور ایبٹ آباد شہر کی اذان کی آواز

گونجی، لیکن یہاں اس باغ میں ابھی بھی
آدھی رات کا سماں تھا

اذان کی آواز فضا میں گونجی تو تھی، لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی دوسری دنیا سے آ رہی ہو۔ اس باغ کی حدوں کے اندر وقت تھم چکا تھا۔ وہ عورت، جس کا سایہ کنویں کی زرد روشنی میں اب لرز رہا تھا، اچانک حسن کی طرف مڑی۔ اس کے بال زمین پر ناگوں کی طرح رینگ رہے تھے۔
"تم نے ڈھونڈ لیا کہ چوڑی کہاں ہے،" اس کی آواز اب کسی سوکھے پتے کے رگڑنے جیسی تھی، "لیکن تم نے اس ہاتھ کو نہیں پہچانا جس نے میرے بچوں کے گلے پر خنجر پھیرا تھا۔ وہ ہاتھ آج بھی زندہ ہے، وہ آج بھی گوشت پوست کے روپ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہے۔"
علی کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے لڑکھڑاتی آواز

میں کہا، "حسن بھائی! یہ کیا کہہ رہی ہے؟ ہم تو بچپن کے دوست ہیں، ہم ایک ہی تھالی میں کھانے والے لوگ ہیں، ہم میں سے قاتل کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ روح ہمیں آپس میں لڑوانا چاہتی ہے!"

حسن نے کچھ جواب نہیں دیا، اس کی نظریں حیدر پر جمی تھیں۔ حیدر، جو اب تک بہت زیادہ ڈرا ہوا تھا، اب بالکل خاموش کھڑا کنویں کی گہرائی کو تک رہا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا، جیسے اس کے اندر سے تمام جذبات نچوڑ لیے گئے ہوں۔ چاند کی مدھم روشنی میں حسن نے ایک ہولناک چیز دیکھی۔ زمین پر علی اور حسن کے سائے تو صاف نظر آ رہے تھے، لیکن حیدر کے قدموں کے نیچے کوئی سایہ نہیں تھا! وہ بالکل ایک شفاف وجود کی طرح کھڑا تھا۔

عورت نے پانچویں پہیلی پھینکی:

"وہ جو تمہارے ساتھ ہے، مگر تمہارا نہیں ہے۔

وہ جو مٹی سے اٹھا ہے، مگر مٹی میں نہیں ملے گا۔ بتاؤ، وہ کون ہے جو اس گھر کا مالک بھی ہے اور قیدی بھی؟"
حسن کا دماغ گھوم گیا۔ اسے یاد آیا کہ ٹیکسی والے نے کہا تھا "مالک باہر ہوتے ہیں"۔ لیکن اس حویلی کے اندر کسی زندہ انسان کے آثار نہیں تھے۔
"حیدر! تمہارا سایہ کہاں ہے؟" علی کی چیخ نکلی۔
حیدر آہستہ سے مڑا۔ اس کے چہرے کی جلد اب کسی سوکھے کاغذ کی طرح سکڑ رہی تھی اور اس کی آنکھیں بالکل سفید ہو چکی تھیں۔ اس نے ایک ایسا قہقہہ لگایا جس سے پہاڑی کے پتھر تھرانے لگے۔
"حسن، تم بہت عقل مند ہو... یہ پہاڑی عقل سے نہیں، خون سے پیاس بجھاتی ہے۔ تمہارا دوست حیدر تو گاڑی سے اترتے ہی اس سائے کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ ابھی اس کنویں کی

تہہ میں اس 'پیاس' کا حصہ بن رہا ہے جو بیس سال پرانی ہے۔"
اچانک حیدر کا وجود دھویں کی طرح بکھرنے لگا اور اس کی جگہ وہی بوڑھا چوکیدار نمودار ہو گیا جس نے انہیں چابی دی تھی۔ وہ دراصل ایک 'ہمزاد' تھا جس نے حیدر کا روپ دھار رکھا تھا۔
"اگر اپنے دوست کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو،" بوڑھے نے خباثت سے کہا، "تو تمہیں اس حویلی کے اس حصے میں جانا ہوگا جہاں بیس سال سے کسی نے قدم نہیں رکھا... حویلی کا وہ خفیہ تہہ خانہ جس کا راستہ صرف اس 'وفاداری' والی چابی سے کھلتا ہے جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔"
علی خوف کے مارے چلانے لگا، "حسن بھائی، بھاگیں یہاں سے! یہ ہمیں مار ڈالے گا!"
لیکن جیسے ہی وہ مڑے، باغ کے درختوں کی شاخیں آپس میں جڑ گئیں اور ایک زندہ دیوار

بن گئیں۔ اب واپسی کا راستہ بند تھا۔ پیچھے وہ تشنہ لب روح کھڑی تھی اور سامنے وہ بوڑھا چوکیدار جو اب اپنی اصل شکل میں آ رہا تھا—ایک ایسا ہیولا جس کا آدھا چہرہ جلا ہوا تھا اور آدھا مٹی سے اٹا ہوا۔

حسن نے مٹھی میں وہ زنگ آلود چابی بھیچی۔ اسے احساس ہوا کہ انہیں دوبارہ اس موت کے گھر میں داخل ہونا تھا، جہاں حیدر کی زندگی ایک ایسے راز کے پیچھے چھپی تھی جو اس خاندان کی موت کا سبب بنا تھا۔

"چلو علی! ہمیں اندر جانا ہوگا۔ حیدر کو ہم یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے، چاہے یہ حویلی ہمیں زندہ ہی کیوں نہ نگل لے

حسن نے جیسے ہی علی کا ہاتھ تھاما، بیری کے درخت کی شاخیں کسی خوفناک پنجے کی طرح ان کی طرف بڑھیں۔ بوڑھے چوکیدار کا قہقہہ اب کسی جانور کی غراہٹ میں بدل چکا تھا۔

"اندر جاؤ! اگر سورج ڈھلنے سے پہلے تم نے اس 'خون کے پیاسے' کو نہ ڈھونڈا جس نے اس خاندان کی جڑیں کاٹیں، تو حیدر کی روح ہمیشہ کے لیے اس کنویں کا ایندھن بن جائے گی!" بوڑھے نے اپنا عصا زمین پر مارا اور ایک زوردار دھماکے کے ساتھ باغ کی زمین شق ہونے لگی۔

حسن اور علی بدحواسی میں دوبارہ حویلی کے مرکزی ہال کی طرف بھاگے۔ اب وہاں کا منظر بالکل بدل چکا تھا۔ وہ فانوس جو پہلے بجھے ہوئے تھے، اب ان میں سے انسانی چربی کے جلنے کی بو آ رہی تھی اور وہ نیلی روشنی دے رہے تھے۔ ہال کی دیواروں پر لگی تصویریں اب ساکت نہیں تھیں؛ ان میں موجود کردار اب فریموں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"حسن بھائی، وہ دیکھو!" علی نے کانپتی انگلی سے سیڑھیوں کے نیچے بنے ایک چھوٹے

سے لکڑی کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دروازہ جو پہلے دیوار کا حصہ معلوم ہوتا تھا، ا۔ حسن نے وہ زنگ آلود چابی نکالی جو اسے باغ میں ملی تھی۔ جیسے ہی وہ چابی اس دروازے کے قریب پہنچی، وہ مقناطیس کی طرح تالے میں جا دھنسی اور ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی صدیوں پرانی چیخ ہو۔ دروازہ کھلتے ہی سامنے تاریک سیڑھیاں تھیں جو کسی پاتال کی طرف جا رہی تھیں۔ علی نے موبائل کی ٹارچ جلانے کی کوشش کی، لیکن روشنی نکلتے ہی بجھ گئی۔

"یہاں کوئی مصنوعی روشنی کام نہیں کرے گی،" حسن نے دھیمی آواز میں کہا۔ "یہاں صرف وہی روشنی چلے گی جو سچائی کی ہو۔"

اچانک دیوار پر لٹکی ایک پرانی مشعل خود بخود جل اٹھی۔ وہ نیچے اترے تو سامنے ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس کے بیچوں بیچ ایک

پرانا شکستہ صندوق رکھا تھا۔ کمرے کے کونوں میں پرانے لباس لٹکے تھے جو ایسے لگ رہے تھے جیسے کوئی انسان وہاں بے جان کھڑا ہو۔

"حیدر! حیدر کہاں ہو تم؟" علی نے پکارا، لیکن جواب میں صرف اس کی اپنی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

صندوق کے پاس پہنچتے ہی حسن کو محسوس ہوا کہ فرش کے نیچے سے پانی کے بہنے کی آواز آ رہی ہے۔ اس نے صندوق کھولا تو اس کے اندر کپڑے نہیں بلکہ وہی پیتل کا پیالہ تھا جو پہلی پہیلی میں ذکر ہوا تھا، لیکن اس کے ساتھ ایک پرانا قانونی کاغذ (اسٹامپ پیپر) بھی تھا۔

حسن نے مشعل کی روشنی میں اسے پڑھنے کی کوشش کی۔ اس پر لکھا تھا:

"یہ زمین بیچ کر پیسے الیاسی مسجد کو عطیہ کرنیے تھے ، لیکن لالچ نے اسے قبرستان بنا دیا۔

جو اسے ہڑپ کرنا چاہے گا، وہ خود اس کی مٹی کا حصہ بنے گا۔"

اچانک دیواروں سے خون رسنے لگا اور ایک بھاری مردانہ آواز گونجی:

"تم نے کاغذ تو پڑھ لیا، لیکن کیا تم اس 'انگوٹھے کے نشان' کو پہچان سکتے ہو جس نے ہم سب کی موت پر مہر لگائی؟"

حیدر کا وجود

اسی لمحے کمرے کے ایک اندھیرے کونے سے حیدر نمودار ہوا۔ لیکن وہ حیدر نہیں تھا جس کے ساتھ وہ ایبٹ آباد آئے تھے۔ اس کا جسم مٹی سے لت پت تھا اور اس کے گلے میں وہی زنگ آلود زنجیر تھی جو چوکیدار کی لالٹین کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔

"حسن... مجھے بچا لو... یہ لوگ مجھے جانے نہیں دے رہے..." حیدر کی آواز اتنی کمزور تھی جیسے وہ میلوں دور سے بول رہا ہو۔

بوڑھا چوکیدار اب دیوار کے سائے سے باہر نکل

آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر تھا جس پر 'بیس سال' پرانا خون اب بھی تازہ لگ رہا تھا۔

"اس کا سودا ہو چکا ہے حسن! ایک جان کے بدلے پانچ جانیں۔ اگر تم اسے لے جانا چاہتے ہو، تو تمہیں اس 'قاتل' کا نام لینا ہوگا جو اس وقت بھی اس کمرے میں موجود ہے اور جس کا تم ذکر کرنا بھول گئے!"

حسن کا ذہن بجلی کی طرح گھوما۔ اس نے علی کو دیکھا، پھر حیدر کو، اور پھر اس بوڑھے چوکیدار کو۔ اسے یاد آیا کہ ٹیکسی والے نے کہا تھا 'مالک باہر ہوتے ہیں'۔

"وہ قاتل کوئی انسان نہیں ہے!" حسن نے بلند آواز میں کہا۔ "وہ قاتل 'لالچ' ہے جو اس بوڑھے چوکیدار کے روپ میں آج بھی اس گھر کا مالک بنا بیٹھا ہے! تم ہی وہ مالک ہو جو باہر ہونے کا ناٹک کرتے ہو، اور تم ہی وہ قیدی ہو جو اس جائیداد کے لالچ میں بیس سال سے

یہاں بھٹک رہے ہو!"
جیسے ہی حسن نے یہ الفاظ کہے، پورے تہہ خانے میں ایک زوردار لرزہ طاری ہوا۔ دیواریں پھٹنے لگیں اور باہر سے ایک چشمے کا پانی کمرے میں داخل ہونے لگا
سیلاب کی وہ گرج اتنی ہولناک تھی کہ حویلی کی بنیادیں لرزنے لگیں۔ حسن نے دیکھا کہ پانی کا رنگ شفاف نہیں بلکہ گہرا سرخ تھا، جیسے زمین کے نیچے دبے برسوں پرانے زخم اچانک پھٹ پڑے ہوں۔
"حسن! حیدر کا ہاتھ پکڑو، وہ ڈوب رہا ہے!"
علی کی چیخ گونجی۔
حیدر، جو زنجیروں میں جڑا ہوا تھا، اب اس سرخ پانی کی لہروں میں غائب ہو رہا تھا۔ بوڑھا چوکیدار، جس کا چہرہ اب پگھلتے ہوئے موم کی طرح لٹک رہا تھا، ہوا میں معلق ہو گیا اور اس کے پیچھے وہی پانچ سائے نمودار ہوئے جن کی پہیلیاں حسن نے بوجھی تھیں۔ ان کی

آنکھوں میں اب درد نہیں بلکہ ایک وحشیانہ انتقام تھا، جیسے وہ اس سیلاب میں حسن اور علی کو بھی اپنے ساتھ ہمیشہ کے لیے غرق کرنا چاہتے ہوں۔

"تم نے سچ تو پایا،" بوڑھے کی آواز اب ہزاروں سسکیوں کا مجموعہ لگ رہی تھی، "لیکن سچ کی قیمت خون ہوتی ہے! اس حویلی کی مٹی نے بیس سال سے کسی زندہ انسان کا گوشت نہیں چکھا... آج یہ پیاس بجھے گی!"

حسن نے مٹھی میں وہ پیتل کا پیالہ اور اسٹامپ پیپر زور سے بھینچ لیا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ کاغذ صرف ایک ثبوت نہیں بلکہ اس روحوں کے جال کی کمزوری ہے۔ اس نے دیکھا کہ جیسے ہی پانی اس کاغذ کو چھوتا، وہاں سے ایک سفید روشنی نکلتی جو ان سایوں کو پیچھے دھکیل دیتی۔

"علی! وہ دیکھو!" حسن نے دیوار کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے پانی کا

ریلا سب سے زیادہ تیزی سے آ رہا تھا۔ وہاں ایک چھوٹی سی کھڑکی نما دراڑ تھی جو شاید باہر کے باغ میں کھلتی تھی۔
وہ دونوں تیرتے ہوئے حیدر کی طرف بڑھے۔ حیدر کی آنکھیں اب کھلی تھیں، لیکن ان میں انسانی چمک ختم ہو رہی تھی۔ اس کے گلے کی زنجیر کسی نادیدہ طاقت نے کھینچی ہوئی تھی۔ حسن نے وہ پیتل کا پیالہ زنجیر کے کڑے پر دے مارا۔ ایک دھاتی جھنکار کے ساتھ زنجیر ٹوٹ گئی، لیکن اسی لمحے بوڑھے چوکیدار نے حسن کا پاؤں پکڑ کر اسے گہرائی میں کھینچنا شروع کر دیا۔
پانی اب ان کے سروں تک پہنچ چکا تھا۔ حسن کا دم گھٹنے لگا۔ پانی کے اندر اسے وہ تمام مناظر نظر آنے لگے جو بیس سال پہلے اس دسترخوان پر پیش آئے تھے۔ اسے وہ معصوم بچے نظر آئے جو اپنی ماں کا آنچل پکڑ کر رو رہے تھے، اور وہ قاتل (چوکیدار) نظر آیا جو

چھپ کر مسکرا رہا تھا۔
حسن نے آخری ہمت جمع کی اور پانی کے اندر ہی وہ اسٹامپ پیپر بوڑھے کے چہرے پر دے مارا، جو کہ مسجد کی وقف زمین کا اصل ثبوت تھا۔
جیسے ہی وہ کاغذ بوڑھے کے لمس سے ٹکرایا، ایک ایسا دھماکا ہوا جیسے آسمان سے بجلی گری ہو۔ وہ بوڑھا ایک دردناک چیخ کے ساتھ راکھ میں بدل گیا اور وہ پانچوں سائے ایک دم سکون کی حالت میں آ گئے، جیسے ان کی صدیوں کی بے چینی ختم ہو گئی ہو۔
پانی کا دباؤ اتنا بڑھا کہ وہ دراڑ ایک بڑے شگاف میں بدل گئی۔ حسن، علی اور حیدر اس ریلے کے ساتھ بہتے ہوئے باہر کی طرف نکل گئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی تاریک غار سے نکل کر زندگی کی روشنی میں آ گئے ہوں۔
جب وہ باہر گرے، تو وہ شملہ پہاڑی کا وہی

پرانا باغ تھا، لیکن اب وہاں کوئی سڑاند نہیں تھی، بلکہ مٹی سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ حویلی جو تھوڑی دیر پہلے ایک محل لگ رہی تھی، اب صرف ٹوٹے ہوئے پتھروں کا ایک ڈھیر تھی جو صدیوں پرانا معلوم ہوتا تھا۔

حیدر نے لمبا سانس لیا اور ہوش میں آتے ہی حسن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "وہ... وہ عورت... وہ مسکرا رہی تھی، حسن!"

حسن نے مڑ کر دیکھا، چاند کی روشنی میں وہ عورت اپنے بچوں کے ساتھ کنویں کے پاس کھڑی تھی، لیکن اب ان کے چہرے پر نور تھا، وحشت نہیں۔ انہوں نے ایک بار حسن کی طرف ہاتھ لہرایا اور پھر دھیرے دھیرے فضا میں تحلیل ہو گئے

ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہوگا،" حسن نے ہانپتے ہوئے کہا اور حیدر کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔ حیدر کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا تھا اور اس

کی نظریں ابھی تک اس جگہ جمی تھیں جہاں وہ کنواں موجود تھا۔ "وہ... وہ سب غائب ہو گئے حسن، لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ اب بھی میری سانسوں میں موجود ہیں۔"

جیسے ہی انہوں نے پہاڑی سے نیچے اترنا شروع کیا، انہیں احساس ہوا کہ راستہ وہ نہیں ہے جس سے وہ اوپر آئے تھے۔ وہ پکی سڑک جو ٹیکسی والے نے دکھائی تھی، اب ایک تنگ اور خاردار پگڈنڈی میں بدل چکی تھی۔ جھاڑیوں سے عجیب و غریب سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں، جیسے کوئی ان کا نام پکار رہا ہو۔

علی: "یار حسن، گاڑی کہاں ہے؟ ہم نے تو یہیں کھڑی کی تھی!"

حسن: "گاڑی کی فکر چھوڑو علی، بس نیچے شہر کی روشنیوں کی طرف بھاگو۔"

اچانک، ان کے سامنے وہی بوڑھا ٹیکسی والا

نمودار ہوا جس نے انہیں اس رہائش گاہ کا راستہ بتایا تھا۔ لیکن اب اس کی ٹیکسی کا ڈھانچہ زنگ آلود تھا اور وہ خود ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا قہقہے لگا رہا تھا۔

"کتنی جلدی میں ہو شہزادو؟" اس نے اپنی پیلی آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو اس 'سودے' کی قیمت باقی ہے جو تم نے تہہ خانے میں کیا تھا۔"

حسن رک گیا۔ اسے یاد آیا کہ تہہ خانے میں جب اس نے وہ اسٹامپ پیپر بوڑھے کے چہرے پر مارا تھا، تو اس نے ایک لمحے کے لیے محسوس کیا تھا کہ اس کے اپنے ہاتھ پر بھی وہی سیاہ نشان ابھر آیا ہے جو اس خاندان کے قاتل کے انگوٹھے کا تھا۔

"کیسا سودا؟" حسن نے گرج کر پوچھا۔

ٹیکسی والے نے انگلی سے شہر کی طرف اشارہ کیا۔ "نیچے جا کر دیکھو، ایبٹ آباد تمہیں پہچانتا بھی ہے یا نہیں؟ شملہ پہاڑی پر

گزری ایک رات، نیچے کی دنیا کے بیس سالوں کے برابر ہوتی ہے۔"
تینوں دوستوں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ بدحواسی میں نیچے کی طرف دوڑے۔ جب وہ ایبٹ آباد کے بازار (نواں شہر) میں پہنچے، تو وہاں کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ پرانی دکانیں غائب تھیں، سڑکوں پر جدید گاڑیاں تھیں جن کے ماڈل انہوں نے کبھی نہیں دیکھے تھے، اور لوگوں کے لباس بالکل مختلف تھے۔
وہ بھاگتے ہوئے الیاسی مسجد پہنچے۔ مسجد تو وہیں تھی، لیکن اس کے ارد گرد کے پکوڑوں والے اور وہ بزرگ کہیں نہیں تھے۔
علی نے مسجد کے چشمے کے پانی میں اپنا عکس دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ پانی میں اسے ایک جوان لڑکا نہیں، بلکہ ایک ادھیڑ عمر آدمی نظر آ رہا تھا جس کے بال سفید ہو چکے تھے۔

"ہم... ہم مر چکے ہیں؟ یا ہم وقت کے اس پار آ گئے ہیں؟" حیدر نے لرزتے ہوئے اپنے چہرے کو چھوا۔

حسن نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اسے وہ زنگ آلود چابی محسوس ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ

وہ ابھی زندہ ہیں، لیکن وہ اس حقیقت کے قیدی بن چکے تھے جسے وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے

علی کی چیخ ا مسجد کے در و دیوار سے ٹکرا کر واپس آئی۔ مسجد کے صحن میں موجود چند نئے چہرے، جو نماز کے لیے جمع ہو رہے تھے، حیرت سے ان تینوں "بوڑھے جوانوں" کو دیکھنے لگے۔ ان کے لیے یہ محض تین پریشان حال مسافر تھے، لیکن حسن، علی اور حیدر کے لیے یہ ایک ایسی قیامت تھی جو بن مانگے آ گئی تھی۔

"یہ نہیں ہو سکتا! حسن بھائی، میری گھڑی

دیکھو، اس پر تو وہی تاریخ ہے جب ہم گھر سے نکلے تھے!" علی نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی کلائی دکھائی، لیکن گھڑی کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا اور سوئیاں ساکت تھیں۔

"حسن... وہ دیکھو،" حیدر نے مسجد کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک بہت بوڑھا شخص لاٹھی کے سہارے بیٹھا انہیں مسلسل گھور رہا تھا۔

وہ وہی پکوڑے والا تھا، جس سے انہوں نے پہلی شام بات کی تھی۔ اب اس کی کمر جھک چکی تھی اور آنکھوں پر موٹا چشمہ تھا، لیکن اس کی یادداشت ابھی مری نہیں تھی۔ اس نے لرزتے قدموں سے ان کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

"تم... تم وہی ہو؟" بوڑھے کی آواز کسی کھوکھلی لکڑی کے ٹوٹنے جیسی تھی۔ "بیس سال پہلے، اسی جگہ... تم نے مجھ سے پکوڑے مانگے تھے اور میں نے کہا تھا کہ شملہ پہاڑی پر رات مت گزارنا۔"

حسن نے بوڑھے کا ہاتھ تھام لیا۔ "چچا! ہمیں بتائیں، یہ سب کیا ہے؟ ہم تو بس ایک رات وہاں رہے، ہم نے تو صرف ان روحوں کو انصاف دیا ہے!"

بوڑھے نے ایک لمبی آہ بھری اور انہیں مسجد کے ایک خاموش گوشے میں لے گیا۔ "بیٹا، شملہ پہاڑی کی وہ حویلی 'وقت کا قید خانہ' ہے۔ وہاں روحیں اس لیے نہیں بھٹکتیں کہ انہیں انصاف چاہیے، بلکہ اس لیے کہ وہ جینے والوں سے ان کا 'وقت' چھین سکیں۔ تم نے ان کی پہیلیاں بوجھ کر انہیں تو آزاد کر دیا، لیکن اس آزادی کی قیمت تمہارے بیس سال تھے جو اس مٹی نے پی لیے۔"

علی پھوٹ کر رونے لگا۔ "میرا خاندان... میری ماں... وہ تو مر چکے ہوں گے!"

حسن کا ذہن ابھی بھی لڑ رہا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے وہ زنگ آلود چابی نکالی جو ابھی تک اس کے پاس تھی۔ جیسے ہی اس نے چابی

نکالی، بوڑھے کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ "یہ چابی ابھی تک تمہارے پاس ہے؟" بوڑھے نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم ابھی پوری طرح واپس نہیں آئے۔ تم اب بھی اس حویلی کے 'مالک' کے قرض دار ہو۔"
اچانک، علی نے اپنے گلے کو پکڑا۔ اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ اس کے سینے پر وہی سیاہ نشان ابھرنے لگا جو تہہ خانے میں حسن نے دیکھا تھا۔
"حسن... مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے... بہت ٹھنڈ..." علی کی آواز مدھم ہونے لگی اور اس کا جسم دھیرے دھیرے شفاف ہونے لگا، جیسے وہ ہوا میں تحلیل ہو رہا ہو۔
حسن کو سمجھ آ گئی کہ وہ بوڑھا چوکیدار (لالچ کا ہمزاد) مرا نہیں تھا۔ اس نے صرف اپنا روپ بدلا تھا۔ وہ ان تینوں میں سے ایک کو واپس لے جانا چاہتا تھا تاکہ حویلی کا تسلسل برقرار رہے۔

"نہیں! میں ایسا نہیں ہونے دوں گا!" حسن نے چابی کو مضبوطی سے پکڑا اور مسجد کے صحن میں لگے اس قدیم پیپل کے درخت کی طرف بھاگا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی جڑیں شملہ پہاڑی تک جاتی ہیں۔

"اگر وقت چھینا جا سکتا ہے، تو اسے واپس بھی لایا جا سکتا ہے!" حسن نے چابی کو درخت کی جڑ میں گاڑنے کی کوشش کی، لیکن زمین پتھر کی طرح سخت ہو چکی تھی۔

اسی لمحے، فضا میں وہی بوڑھے چوکیدار کا قہقہہ گونجا، لیکن اس بار وہ آواز کسی انسان کی نہیں بلکہ پوری پہاڑی کی تھی:

"تم نے انصاف تو کیا، مگر سودا کرنا بھول گئے۔ ایک جان تو یہاں رہے گی، یا تو تمہاری، یا تمہارے دوست کی!"

حیدر نے حسن کا ہاتھ روک لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سکون تھا۔

"حسن... میں نے اس کنویں میں اپنی روح کا

ایک حصہ چھوڑ دیا تھا۔ علی کو بچا لو۔ میں
واپس جا رہا ہوں
حیدر کے لہجے میں ایسی قطعیت تھی کہ
حسن کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ مسجد کے صحن
میں لگے پیپل کے پتے خوفناک طریقے سے
سرسرانے لگے۔ علی اب گھٹنوں کے بل گر چکا
تھا، اس کا جسم دھیرے دھیرے دھندلا ہو رہا
تھا، جیسے کوئی پرانی تصویر دھوپ میں پڑی
مٹ رہی ہو۔
"نہیں حیدر! ہم ساتھ آئے تھے، ساتھ جائیں
گے،" حسن نے دھاڑ کر کہا۔ اس نے اپنی جیب
سے وہ اسٹامپ پیپر نکالا جو تہہ خانے سے
ملا تھا۔ اس کاغذ پر اب بھی وہ خون آلود
انگوٹھے کا نشان چمک رہا تھا، لیکن اب وہ
نشان پھیل کر پورے کاغذ کو سیاہ کر رہا تھا۔
بوڑھے پکوڑے والے نے دور سے چلا کر کہا:
"حسن! اس کاغذ کو جلا دو! یہ کاغذ اس
حویلی کی جڑ ہے، یہی وہ 'لالچ' کا عہد نامہ

ہے جس نے وقت کو قید کر رکھا ہے۔ اگر یہ جل گیا تو وقت کا پہیہ الٹا گھومے گا، لیکن یاد رکھنا... جو اس آگ کو جلائے گا، اسے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اس کی نذر کرنا ہوگا!"

حسن نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا۔ اس نے جیب سے ماچس نکالی۔ علی کی حالت اب یہ تھی کہ اس کا نچلا دھڑ بالکل غائب ہو چکا تھا اور وہ ہوا میں معلق تھا۔

"حسن بھائی، مت کریں! آپ کی زندگی..." علی کی آواز کسی دور افتادہ کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

حسن نے تیلی جلائی اور اس سیاہ کاغذ کے کونے کو آگ لگا دی۔ جیسے ہی آگ لگی، ایک ایسی ہولناک چیخ بلند ہوئی جو پورے ایبٹ آباد میں سنی گئی ہوگی۔ وہ آگ عام نہیں تھی؛ اس سے نکلنے والا دھواں نیلا اور سبز تھا، اور اس میں وہ تمام چہرے نظر آ رہے تھے جو شملہ پہاڑی کی اس حویلی میں قید تھے۔

جیسے جیسے کاغذ جل رہا تھا، حسن کو محسوس ہوا کہ اس کے اپنے ہاتھ کی جلد ڈھلی ہو رہی ہے، اس کی بینائی دھندلا رہی ہے اور اس کی کمر میں ایک شدید درد لہر بن کر دوڑ رہا ہے۔ وہ بوڑھا ہو رہا تھا، لیکن اس کے بدلے میں علی کا وجود دوبارہ ٹھوس ہوتا جا رہا تھا۔

وقت کی لہریں کسی ریگ مال کی طرح ان کے گرد گھومنے لگیں۔

حیدر: "حسن! تمہارے بال... تمہارے بال سفید ہو رہے ہیں!"

حسن: (دھیمی آواز میں) "کچھ نہیں ہوتا... بس اس دھوئیں سے باہر نکلو!"

جب کاغذ کا آخری ٹکڑا راکھ بن کر اڑا، تو ایک زوردار روشنی نے سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ حسن کو ایسا لگا جیسے وہ کسی اونچی پہاڑی سے نیچے گر رہا ہو۔اسے پکوڑوں کی خوشبو آئی، ٹھنڈے پانی کی آواز سنائی

دی، اور پھر سب کچھ اندھیرا ہو گیا۔
"یار حسن، اٹھو نا! گاڑی میں ہی سو گئے کیا؟"
حسن نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ وہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا، اس کا سر اسٹیرنگ پر تھا۔ سامنے مسجد کے مینار شام کی سرخی میں چمک رہے تھے۔ علی پچھلی سیٹ پر انگڑائی لے رہا تھا اور حیدر باہر کھڑا پکوڑے خرید رہا تھا۔
"کتنی دیر سوئے ہو بھائی؟ ابھی تو پکوڑے بھی گرم ہیں،" حیدر نے گاڑی کی کھڑکی پر دستک دیتے ہوئے کہا۔
حسن نے کانپتے ہاتھوں سے ریئر ویو مرر (شیشے) میں اپنا چہرہ دیکھا۔ وہ وہی جوان حسن تھا، لیکن اس کی کنپٹی کے پاس بالوں کی ایک لٹ بالکل سفید ہو چکی تھی—وقت کے اس سودے کا واحد نشان۔
اس نے جلدی سے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ تاریخ وہی تھی، سال وہی تھا: جون

2026-

"چلو، یہاں سے نکلتے ہیں،" حسن نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"کدھر؟ وہ ٹیکسی والے نے بتایا تھا نا کہ شملہ پہاڑی پر ایک پرانی رہائش گاہ ہے، وہاں چلتے ہیں؟" علی نے جوش سے پوچھا۔

حسن کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ اس نے گاڑی کا رخ واپس ایبٹ آباد شہر کی طرف موڑ دیا۔

"نہیں علی، ہم کسی ہوٹل میں رکیں گے، چاہے گاڑی میں ہی رات گزارنی پڑے... لیکن شملہ پہاڑی کی طرف کبھی نہیں جائیں گے۔"

جب گاڑی مڑی، تو حسن کی نظر سڑک کنارے کھڑے اسی بوڑھے ٹیکسی والے پر پڑی۔ وہ اپنی لالٹین لیے انہیں دیکھ کر دانت نکال کر ہنس رہا تھا، اور اس کے ہاتھ میں وہی زنگ آلود چابی تھی جو حسن نے درخت کی جڑ میں گاڑنے کی کوشش کی تھی

"یار حسن، اتنی جلدی کیوں ہے؟ ابھی تو ہم نے وہ مشہور قہوہ بھی نہیں پیا،" علی نے پیچھے سے گلہ کیا، وہ ابھی تک اس خوفناک خواب سے بے خبر تھا جس سے حسن ابھی ابھی نکلا تھا۔

حیدر، جو برابر والی سیٹ پر بیٹھا پکوڑے کھا رہا تھا، اچانک رک گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنی گردن کی طرف بڑھایا جہاں اسے ایک ہلکی سی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔

"حسن... یہ دیکھنا، میری گردن پر یہ کیا ہے؟"

حسن نے ایک لمحے کے لیے نظر سڑک سے ہٹا کر حیدر کی طرف دیکھا۔ حیدر کی گردن پر وہی کالا دھبہ ابھر رہا تھا جو تہہ خانے والی اس روح کے انگوٹھے کا نشان تھا۔ حسن کے ہاتھ اسٹیرنگ پر لرزنے لگے۔

شہر کی روشنیاں قریب آ رہی تھیں، لیکن جیسے جیسے وہ ہوٹل کی تلاش میں آگے بڑھ رہے تھے، حسن کو محسوس ہوا کہ سڑکیں وہ

نہیں ہیں جو نقشے پر ہونی چاہئیں۔ ہر موڑ انہیں گھم پھرا کر دوبارہ اسی راستے پر لے آتا تھا جو اوپر شملہ پہاڑی کی طرف جاتا تھا۔

علی: "یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم پچھلے دس منٹ سے اسی پیلے سائن بورڈ کے پاس سے تیسری بار گزر رہے ہیں۔"

حسن: "خاموش رہو علی! بس دعا کرو کہ ہم کسی طرح مین روڈ پر پہنچ جائیں۔"

اچانک گاڑی کا ریڈی ایٹر پھٹنے جیسی آواز آئی اور انجن سے دھواں نکلنے لگا۔ گاڑی ایک ایسے مقام پر آ کر رک گئی جہاں اس پاس صرف گھنا جنگل تھا اور سامنے ایک پرانا لکڑی کا بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا: "شملہ ہلز – شارٹ کٹ"۔

گاڑی کے رکتے ہی خاموشی اتنی گھری ہو گئی کہ انہیں اپنی سانسیں سنائی دینے لگیں۔

اچانک گاڑی کی چھت پر ایک زوردار آواز آئی، جیسے کسی نے اوپر سے چھلانگ لگائی ہو۔

گاڑی کی کھڑکی کے شیشے پر باہر سے ایک ہاتھ نمودار ہوا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس میں وہ زنگ آلود چابی تھی جو حسن نے سمجھا تھا کہ وہ وقت کے ساتھ جل چکی ہے۔ وہ بوڑھا ٹیکسی والا شیشے کے دوسری طرف کھڑا تھا، اس کا چہرہ اب مکمل طور پر مسخ ہو چکا تھا اور اس کی آنکھوں میں وہی نیلی روشنی تھی۔

"تم نے کاغذ تو جلا دیا حسن،" بوڑھے کی آواز براہِ راست ان کے دماغوں میں گونجی، "لیکن وہ 'قرض' جو تم نے اپنے دوست کی زندگی کے بدلے لیا تھا، وہ ابھی ادھورا ہے۔ تم نے اپنی کنپٹی کے بال سفید کر کے وقت تو خریدا، لیکن اس چابی کا تالا ابھی بھی تمہارے سینے میں چھپا ہے۔"

حیدر نے اچانک ایک زوردار چیخ ماری۔ اس کا جسم اکڑ گیا اور اس کی آنکھیں سفید ہونے لگیں۔ علی نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی،

لیکن حیدر کا جسم اتنا گرم تھا جیسے وہ کسی بھٹی میں جل رہا ہو۔

"حسن! اس کے جسم سے دھواں نکل رہا ہے!" علی چیخا۔

حسن کو سمجھ آ گئی کہ وہ کاغذ جلانا صرف ایک عارضی حل تھا۔ وہ بوڑھا چوکیدار دراصل اس زمین کا محافظ نہیں تھا، بلکہ وہ اس 'لالچ' کی علامت تھا جو صدیوں سے اس پہاڑی پر مسافروں کا شکار کر رہا تھا۔ وہ ان تینوں کو الگ الگ نہیں چھوڑے گا۔

حسن نے گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ "باہر نکلو! گاڑی اب ہمیں نہیں بچا سکتی!"

وہ جنگل کی طرف بھاگے، جہاں درختوں کے درمیان وہی نیلی دھند دوبارہ پھیل رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے حسن کی نظر ایک پرانی غار نما جگہ پر پڑی جہاں ایک چھوٹا سا چراغ جل رہا تھا۔ وہاں ایک درویش صفت انسان بیٹھا تسبیح پڑھ رہا تھا۔

"ادھر آ جاؤ مسافرو!" درویش نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "اس دائرے کے اندر آ جاؤ، ورنہ شملہ کی روحیں تمہارا سایہ چھین لیں گی۔"
جیسے ہی وہ اس درویش کے پاس پہنچے، بوڑھے چوکیدار کی آواز جنگل میں گرجی:
"بوڑھے درویش! تو ان کا سودا نہیں روک سکتا۔ انہوں نے 'وقت' چرایا ہے، اور وقت کی واپسی صرف ایک ہی طریقے سے ممکن ہے۔"
درویش نے حسن کی طرف دیکھا، اس کی نظریں حسن کی سفید لٹ پر جم گئیں۔
"بیٹا، تم نے ہمت تو بڑی کی، لیکن تم نے موت کو دھوکہ دیا ہے۔ اب یہ آخری پہیلی تمہاری زندگی کا فیصلہ کرے گی۔ اگر جواب غلط ہوا، تو تم تینوں ہمیشہ کے لیے اس چابی کے اندر قید ہو جاؤ گے۔"
درویش نے مٹی پر ایک لکیر کھینچی اور پوچھا:
"وہ کیا ہے جو پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے، جس

کا کوئی جسم نہیں مگر وہ پہاڑوں کو ہلا دیتا ہے، اور جسے تم نے مسجد میں چھوڑا تھا مگر وہ اب بھی تمہارے خون میں دوڑ رہا ہے؟"
حیدر کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اور علی رو رہا تھا۔ حسن نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں چاند بادلوں میں چھپ رہا تھا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر اس پوری رات کے واقعات کو ترتیب دینے لگا

درویش کی آواز کے ساتھ ہی پورے جنگل میں ایک ہولناک خاموشی چھا گئی۔ ہوا ساکت ہو گئی، یہاں تک کہ پتے سرسرانا بھی بند ہو گئے۔ حسن کے کانوں میں اس درویش کے الفاظ کسی ہتھوڑے کی طرح بج رہے تھے۔
"وہ کیا ہے جو پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے، جس کا کوئی جسم نہیں مگر وہ پہاڑوں کو ہلا دیتا ہے، اور جسے تم نے مسجد میں چھوڑا تھا مگر وہ اب بھی تمہارے خون میں دوڑ رہا ہے
حسن نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایبٹ آباد

کی اس سرد شام کو یاد کرنے لگا جب وہ اس شہر میں پہنچے تھے۔ پکوڑوں کی خوشبو، وہ ٹھنڈا چشمہ، وہ سکون... لیکن ان سب کے درمیان ایک چیز ایسی تھی جو ان کے ساتھ آئی تھی اور وہیں کہیں رہ گئی تھی۔

علی نے حیدر کا ہاتھ تھاما ہوا تھا، جو اب تڑپنا بند کر چکا تھا لیکن اس کا جسم کسی لکڑی کی طرح سخت ہو گیا تھا۔ "حسن بھائی! جواب دیں، وہ چوکیدار قریب آ رہا ہے!" علی کی آواز میں موت کا خوف تھا۔

باہر دھند کے اندر سے وہ بوڑھا چوکیدار اب رینگتا ہوا دائرے کے قریب آ رہا تھا۔ اس کی انگلیوں کے ناخن زمین کو کھرچ رہے تھے، جس سے ایک کریہہ آواز پیدا ہو رہی تھی۔ "جواب دو حسن! تمہاری عقل اب تمہارا ساتھ نہیں دے گی۔ وہ چیز جو تم نے مسجد سے گھوما۔ اسے یاد آیا کہ ب وہ مسجد کے چشمے پر وو کر رہے تھے، تو ان کے دلوں میں ایک

عجیب سا یقین تھا۔ وہ یقین جو انسان کو ہر خطرے سے بے نیاز کر دیتا ہے، لیکن جیسے ہی وہ اس حویلی کی طرف بڑھے تھے، وہ یقین بدل گیا تھا۔

"وہ 'توکل' (بھروسہ) تھا!" حسن نے ایک دم آنکھیں کھول کر کہا۔

درویش نے تسبیح روک دی، لیکن اس کے چہرے پر ابھی بھی کوئی تاثر نہیں تھا۔

"نہیں بیٹا، سوچو! توکل تو پیدا ہوتے ہی نہیں مرتا۔ توکل تو ابدی ہوتا ہے۔"

حسن کا ماتھا پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اسے دوبارہ سوچنا پڑا۔ پیدا ہوتے ہی مر جانا... جسم نہ ہونا... پہاڑوں کو ہلا دینا... اور مسجد میں چھوٹ جانا۔

اچانک حسن کو وہ لمحہ یاد آیا جب انہوں نے مسجد کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا کہ "کچھ بھی ہو جائے، ہم ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے"۔ لیکن

جیسے ہی وہ حویلی میں داخل ہوئے تھے، ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف 'شک' اور 'خوف' پیدا ہو گیا تھا۔

"وہ 'وعدہ' **(Commitment)** تھا!" حسن نے بلند آواز میں کہا۔ "ہم نے مسجد میں خدا کے گھر کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا جو عہد کیا تھا، وہ حویلی کی پہلی دہلیز پار کرتے ہی مر گیا تھا! وہ وعدہ جو پہاڑوں جیسے ارادوں کو ہلا دیتا ہے، لیکن ہمارے خوف نے اسے وہیں دفن کر دیا تھا۔"

درویش نے اپنی آنکھیں کھولیں، جن میں اب ایک عجیب سی چمک تھی۔ "نزدیک پہنچ گئے ہو، لیکن ابھی بھی ایک کڑی باقی ہے۔ وہ کیا ہے جو تمہارے خون میں دوڑ رہا ہے؟"

حسن نے حیدر کی گردن پر موجود اس کالے نشان کو دیکھا۔

اور جواب دیا

"وہ 'خوف' **(Fear)** ہے!۔ "وہ خوف جو ہم نے

مسجد کے سکون میں چھوڑا تھا، لیکن اس حویلی نے اسے ہمارے خون میں اتار دیا۔ وہ خوف جو ہر لمحہ پیدا ہوتا ہے اور اگلے ہی لمحے مر کر ایک نیا خوف پیدا کرتا ہے۔ وہی خوف جو پہاڑ جیسے انسانوں کو مٹی کر دیتا ہے!"

جیسے ہی حسن نے 'خوف' کا لفظ ادا کیا، وہ بوڑھا چوکیدار جو دائرے کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا، ایک ہولناک چیخ مار کر پیچھے گرا۔ اس کے ہاتھ سے وہ زنگ آلود چابی چھوٹ کر زمین پر گری اور پگھل کر سیاہ تیل بن گئی۔

حیدر نے ایک لمبا سانس لیا اور اس کی آنکھیں واپس اپنی اصلی حالت میں آ گئیں۔ اس کی گردن کا وہ کالا نشان مٹنے لگا، لیکن وہ نشان مٹ کر اب حسن کے اپنے سینے پر منتقل ہو رہا تھا۔

درویش اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم نے پہیلی تو بوجھ لی، لیکن اس کا بوجھ اب تمہیں اکیلے اٹھانا

ہوگا۔ شملہ پہاڑی کی روحیں اب تمہیں نہیں، تمہارے اندر کے اس خوف کو پوجیں گی جو تم نے تسلیم کر لیا ہے۔"

جنگل کی دھند چھٹنے لگی اور دور کہیں ایبٹ آباد کے بازاروں کے شور کی دھیمی سی آواز آنے لگی۔

"چلو، یہاں سے نکلو،" درویش نے ہاتھ کے اشارے سے راستہ دکھایا۔ "لیکن یاد رکھنا حسن، وہ چابی پگھل چکی ہے، مگر اس کا تالا اب تمہارے دل میں ہے۔ جب بھی تم ڈرو گے، وہ حویلی دوبارہ تمہارے سامنے کھڑی ہو جائے گی۔"

حسن، علی اور حیدر لڑکھڑاتے ہوئے اس غار سے باہر نکلے۔ سڑک اب وہی تھی جہاں ان کی گاڑی کھڑی تھی، لیکن گاڑی کا ٹائر اب بھی اسی جگہ جام تھا جہاں وہ رکی تھی گاڑی کے ٹائروں کے نیچے سوکھے پتے کچلے جانے کی آواز اب کسی ہڈی کے ٹوٹنے جیسی

محسوس ہو رہی تھی۔ حسن نے جیسے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا، اسے احساس ہوا کہ جنگل کی ہوا اب ساکت نہیں تھی، بلکہ اس میں کسی کے سانس لینے کی بھاری آواز شامل تھی۔

علی نے حیدر کو پچھلی سیٹ پر لٹایا، جس کا جسم اب بھی لرز رہا تھا۔ "حسن بھائی، وہ درویش کدھر گیا؟" علی نے مڑ کر دیکھا تو وہاں نہ کوئی غار تھی اور نہ ہی کوئی چراغ۔ صرف گھنی جھاڑیاں تھیں جو رات کے اندھیرے میں کسی جلے ہوئے ہاتھ کی طرح اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

حسن نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی، لیکن سوئچ گھماتے ہی ڈیش بورڈ کی روشنیاں سرخ ہو گئیں۔ سپیڈومیٹر کی سوئی خود بخود گھومنے لگی اور ریڈیو سے ایک ایسی آواز آئی جیسے سینکڑوں لوگ ایک ساتھ سسکیاں بھر رہے ہوں۔

"تم نے... جواب تو دے دیا..." ریڈیو سے وہی بوڑھے چوکیدار کی آواز گونجی، لیکن اب وہ آواز حسن کے اپنے حلق سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ "لیکن 'خوف' کا اعتراف کرنا اسے ختم کرنا نہیں ہوتا، اسے دعوت دینا ہوتا ہے۔"

وہ چوتھا

اچانک گاڑی کی پچھلی کھڑکی پر ایک دستک ہوئی۔ علی نے ڈر کر پیچھے دیکھا، لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر جیسے ہی اس نے اپنی نظریں ہٹائیں، گاڑی کے اندرونی آئینے **(Mirror)** میں اسے نظر آیا کہ حیدر کے برابر والی سیٹ پر کوئی چوتھا شخص بیٹھا ہے۔

وہ ایک دھندلا سا سایہ تھا، جس نے وہی سفید لبادہ پہن رکھا تھا جو حسن نے اس لڑکی کو پہنے ہوئے دیکھا تھا۔

"حسن! پیچھے دیکھو!" علی کی چیخ گاڑی کی چھت سے ٹکرائی۔

حسن نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اسے معلوم

تھا کہ اگر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ اس سائے کی آنکھوں میں قید ہو جائے گا۔ اس نے پوری طاقت سے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھا۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی، لیکن اسے محسوس ہوا کہ گاڑی کا وزن دگنا ہو چکا ہے، جیسے وہ اکیلے تین لوگوں کو نہیں بلکہ پورے قبرستان کو کھینچ رہا ہو۔

جیسے ہی گاڑی شملہ پہاڑی کی ڈھلوان سے نیچے اتری اور شہر کی پہلی لائٹ نظر آئی، حیدر نے اچانک حسن کا کندھا پکڑ لیا۔ اس کے ناخن حسن کی جلد میں پیوست ہو رہے تھے۔ "حسن... وہ چابی... وہ پگھلی نہیں تھی..." حیدر نے ہانپتے ہوئے کہا اور اپنا ہاتھ کھولا، اس کی ہتھیلی پر وہی سیاہ تیل کا نشان تھا جو اب ایک تالے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ "وہ درویش... وہ بھی اسی حویلی کا ایک حصہ تھا۔ اس نے تمہیں وہ جواب دلوا کر

تمہارے 'خوف' کو ایک ٹھوس شکل دے دی ہے۔"
حسن نے دیکھا کہ ونڈ اسکرین پر اب باہر سے نہیں بلکہ اندر سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ وہ بوندیں مل کر ایک جملہ لکھ رہی تھیں:
"تمہارا سفر ختم نہیں ہوا، یہ تو صرف ایک موڑ ہے!"
شہر کے قریب پہنچتے ہی گاڑی کا انجن خود بخود بند ہو گیا۔ وہ اب مین روڈ پر تھے، جہاں دور دور تک کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ سڑک کے بیچوں بیچ وہی بوڑھا ٹیکسی والا اپنی لالٹین لیے کھڑا تھا، لیکن اب اس کے ساتھ وہ پانچوں سائے بھی تھے جنہیں حسن نے آزاد کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔
ان کے چہرے پر اب وہ نور نہیں تھا جو حسن نے تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا، بلکہ وہ اب پہلے سے زیادہ وحشت ناک لگ رہے تھے۔ ان کے

ہاتھوں میں وہی پرانی پلیٹیں تھیں جن میں اب 'شک' اور 'لالچ' کا زہر بھرا ہوا تھا۔

"ہم نے تمہارا پیچھا نہیں کیا حسن،" بوڑھے نے اپنی لالٹین بلند کی، "تم نے ہمیں اپنے ساتھ لانے کا فیصلہ خود کیا تھا جب تم نے اس 'سودے' کی راکھ اپنے سینے پر ملی تھی۔"

حسن نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا، جہاں وہ کالا نشان اب دھک دھک کر رہا تھا، جیسے وہاں ایک دوسرا دل دھڑک رہا ہو۔ اسے احساس ہوا کہ وہ اب کبھی تنہا نہیں ہوگا۔ وہ جہاں بھی جائے گا، ایبٹ آباد کی یہ روحیں اس کے سائے میں چھپی رہیں گی

"حسن! دیکھو، شہر کے مینار نظر آ رہے ہیں، لیکن وہاں کوئی روشنی کیوں نہیں ہے؟" علی کی آواز سسکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

حسن نے سامنے دیکھا۔ ایبٹ آباد کا وہ شہر جو ہمیشہ چہل پہل سے بھرپور رہتا تھا، اب

ایک قدیم قبرستان کی طرح خاموش تھا۔
گھڑیوں کی سوئیاں ساکت تھیں، اور پرندے
درختوں پر پتھر کے بت بنے بیٹھے تھے۔
"ہمیں وہاں جانا ہوگا جہاں سے یہ سب شروع
ہوا تھا،" حسن نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
"الیاسی مسجد کا وہ ٹھنڈا چشمہ... وہ صرف
پانی نہیں ہے، وہ اس مٹی کی پاکیزگی ہے۔ ان
روحوں کا زہر صرف وہی پانی دھو سکتا ہے۔"
جیسے ہی حسن نے گاڑی کا رخ مسجد کی
طرف موڑنا چاہا، گاڑی کے اندر بیٹھا وہ چوتھا
سایہ زور سے ہنسا۔ "تم وہاں نہیں جا سکتے
حسن! وہ پانی تمہارے گناہوں کا بوجھ نہیں
اٹھائے گا، کیونکہ تم نے 'شک' کا پیالہ خود پیا
تھا۔"

حسن نے جواب دینے کے بجائے ایکسیلیٹر پر
پاؤں رکھ دیا۔ بوڑھا چوکیدار اپنی لالٹین
لہراتا ہوا سڑک کے بیچوں بیچ آ گیا، اس کے
پیچھے وہ پانچوں سائے ایک دیوار بن کر

کھڑے ہو گئے۔
"رک جاؤ مسافر! اگر تم نے قدم آگے بڑھایا تو تمہارا یہ دوست حیدر کبھی واپس نہیں آئے گا!" بوڑھے نے دھاڑ کر کہا۔
حسن نے دیکھا کہ حیدر کا جسم اب تیزی سے مٹی میں بدل رہا تھا۔ اس کے پاؤں پہلے ہی خاک بن کر گاڑی کے فرش پر بکھر چکے تھے۔
"حسن بھائی... مجھے چھوڑ دو... تم بچ جاؤ..." حیدر کی آواز اب کسی دور افتادہ غار سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔
لیکن حسن نے ہمت نہیں ہاری۔ اسے یاد آیا کہ اس درویش نے کہا تھا، "وہ کیا ہے جو تمہارے خون میں دوڑ رہا ہے؟" اس نے سمجھا تھا کہ وہ 'خوف' ہے، لیکن اب اسے احساس ہوا کہ وہ 'وفاداری' تھی جو اس نے باغ میں ڈھونڈی تھی۔
"علی! حیدر کا ہاتھ پکڑو اور کلمہ پڑھنا شروع کرو!" حسن نے چیخ کر کہا۔

حسن نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی اور بھاگتا ہوا مسجد کے گیٹ تک پہنچا۔ بوڑھا چوکیدار اس کے پیچھے لپکا، اس کے ناخن حسن کی پیٹھ میں پیوست ہونے ہی والے تھے کہ حسن نے وہ پیتل کا پیالہ، چشمے کے پانی سے بھرا اور اپنے سینے پر موجود اس کالے نشان پر انڈیل دیا۔

جیسے ہی وہ ٹھنڈا پانی اس شیطانی نشان سے ٹکرایا، ایک ایسی چنگاری نکلی جس نے پوری شملہ پہاڑی کو روشن کر دیا۔ وہ کالا نشان پگھل کر زمین پر گرا اور جیتے جاگتے سانپ کی طرح تڑپنے لگا۔

"تمہارا کھیل ختم ہوا!" حسن نے بلند آواز میں کہا۔ "یہ مٹی تمہاری نہیں ہے، یہ ان لوگوں کی ہے جو یہاں سکون ڈھونڈنے آتے ہیں۔ تمہارا لالچ، تمہارا شک اور تمہاری پہیلیاں اب اس پانی میں غرق ہوں گی!"

مسجد کے چشمے سے اچانک پانی کا ایک

عظیم ریلا نکلا، جو عام پانی نہیں تھا بلکہ ایک سفید روشنی کی لہر تھی۔ اس لہر نے بوڑھے چوکیدار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی لالٹین پھٹ گئی اور اس کے اندر سے نکلنے والی نیلی آگ بجھ گئی۔

وہ پانچوں سائے، جو بیس سال سے قید تھے، اب دھیرے دھیرے انسانی شکل اختیار کرنے لگے۔ ان کے چہروں سے وحشت غائب ہو گئی اور ایک ابدی سکون چھا گیا۔ عورت نے آخری بار حسن کی طرف دیکھا، اس بار اس کی آنکھوں میں خون نہیں بلکہ آنسو تھے— شکرگزاری کے آنسو۔ وہ اپنے بچوں کا ہاتھ پکڑ کر اس سفید روشنی میں تحلیل ہو گئی۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور حسن بے ہوش ہو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی، تو پرندوں کے چہچہانے کی آواز آ رہی تھی۔ سورج کی پہلی کرن شملہ پہاڑی کی چوٹی کو چھو رہی تھی۔

حسن نے دیکھا کہ وہ مسجد کی سیڑھیوں پر لیٹا ہوا ہے۔ علی اور حیدر اس کے پاس ہی بیٹھے تھے، وہ دونوں بالکل ٹھیک تھے اور حیدر کے پاؤں بھی سلامت تھے۔

"حسن بھائی! آپ ٹھیک ہیں؟ ہم نے سمجھا آپ ہمیں چھوڑ گئے۔" علی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔

حسن نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ وہاں کوئی نشان نہیں تھا، صرف ایک ہلکی سی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے شملہ پہاڑی کی طرف دیکھا۔ وہاں اب کوئی دھند نہیں تھی، کوئی حویلی نہیں تھی۔ صرف سبزہ اور چیڑ کے درخت تھے جو صبح کی ہوا میں جھوم رہے تھے۔

"چلو گھر چلتے ہیں،" حسن نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

جب وہ گاڑی میں بیٹھے، تو حسن نے دیکھا کہ ڈیش بورڈ پر ایک چھوٹی سی 'ٹوٹی ہوئی

چوڑی' پڑی تھی۔ اس نے اسے اٹھایا اور احترام سے مسجد کے پاس موجود ایک قدیم درخت کی جڑ میں دفن کر دیا۔
شملہ پہاڑی کی روحیں اب آزاد ہو چکی تھیں۔ ایبٹ آباد کی فضا میں اب صرف مسجد کی اذان کی گونج تھی اور ٹھنڈے چشمے کا بہتا ہوا پانی، جو ہر درد اور ہر خوف کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا



کہانی:میری شہزادی

ازقلم :کامی

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور میانوالی کی سرخ مٹی پر ڈھلتے سورج کی کرنیں ایک عجیب سا طلائی رنگ بکھیر رہی تھیں۔ دور افق پر پہاڑوں کی لکیریں دھندلی پڑ رہی تھیں، لیکن چوہدری حشمت کی حویلی کے بلند و بالا دروازے آج بھی اسی وقار سے

کھڑے تھے جیسے صدیوں سے اس علاقے کی رکھوالی کر رہے ہوں۔
حویلی کے اندرونی صحن میں، جہاں رات کی رانی کی خوشبو فضا کو معطر کر رہی تھی، عنایہ اپنی پسندیدہ آرام دہ کرسی پر بیٹھی ایک پرانی کتاب کے صفحات پلٹ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ایسی معصومیت تھی جو صرف ان لوگوں کے پاس ہوتی ہے جنہوں نے دنیا کی تلخیوں کو کبھی قریب سے نہ دیکھا ہو۔ اسے سب "شہزادی" کہتے تھے، اور وہ تھی بھی ایسی ہی—نازک، حساس اور محبتوں میں پلی ہوئی۔
"عنایہ! تم پھر کتاب میں کھو گئیں؟ دیکھو شام ہو گئی ہے، اب تو اندر آ جاؤ،" بیگم زبیدہ نے برآمدے سے آواز دی، ان کے لہجے میں وہی مخلصانہ ممتا تھی جو اس گھر کی بنیاد تھی۔
"بس تھوڑی دیر اور امی جان، یہ باب ختم کر لوں،" عنایہ نے مسکرا کر جواب دیا، مگر اس

کی نظریں کتاب سے زیادہ اس پرندے پر تھیں جو نیم کے درخت پر اپنا گھونسلا درست کر رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی اپنی زندگی کا گھونسلا بھی اب ایک نئے امتحان کی زد میں آنے والا ہے۔

اسی وقت، حویلی کے بیرونی دیوان خانے میں ایک اہم گفتگو جاری تھی۔ چوہدری حشمت، جن کے چہرے کی جھریاں ان کے تجربے اور رعب کی گواہی دیتی تھیں، اپنے بچپن کے دوست افتخار احمد کے سامنے بیٹھے تھے۔ افتخار صاحب شہر سے خاص طور پر ایک پرانے وعدے کی تجدید کے لیے بلائے گئے تھے۔

"افتخار! وقت ہاتھ سے ریت کی طرح پھسل رہا ہے،" چوہدری صاحب نے حقے کا ایک لمبا کش لے کر کہا۔ "میری شہزادی اب بڑی ہو گئی ہے، اور میرے دشمن اب اس کی معصومیت کو ڈھال بنا کر مجھ پر وار کرنا چاہتے ہیں۔

مجھے ایک ایسا محافظ چاہیے جو صرف طاقتور ہی نہ ہو، بلکہ جس کا دل سونے کا ہو اور روح شفاف۔"

افتخار احمد نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔

"حشمت! میں تمہاری پریشانی سمجھ سکتا ہوں۔ میرا بیٹا آریان، وہ ضدی ضرور ہے، لیکن اس کی رگوں میں میرا خون ہے۔ وہ امانت کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔ میں اسے کل ہی یہاں لے آؤں گا۔"

شہر کی ایک بلند و بالا عمارت کے تیرہویں فلور پر، جہاں رات کی روشنیاں کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں، آریان اپنے لیپ ٹاپ پر کسی پیچیدہ پراجیکٹ میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تھکن تھی مگر عزم اس سے کہیں زیادہ تھا۔ وہ ایک ایسا نوجوان تھا جس نے اپنی محنت سے اپنا نام بنایا تھا، اسے "ورثے" اور "جاگیرداری" جیسے لفظوں سے چڑ تھی۔

دروازہ کھلا اور اس کا لنگوٹیا یار دانیال کافی

کے دو مگ لیے داخل ہوا۔
"اوئے ورکاہولک! بس کر دے، اب تو کمپیوٹر بھی تجھ سے پناہ مانگ رہا ہوگا،" دانیال نے ہنستے ہوئے کہا۔
آریان نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور چشمہ اتار کر میز پر رکھا۔ "کام ہی تو ہے جو انسان کو زندہ رکھتا ہے دانیال۔ باقی سب تو ڈھونگ ہے۔"
"اچھا؟ تو پھر کل جو تم گاؤں جا رہے ہو، وہ بھی ڈھونگ ہے؟" دانیال نے چٹکی لی۔ "میں نے سنا ہے چوہدری صاحب کی بیٹی واقعی پری جمال ہے۔ لوگ اسے 'شہزادی' کہتے ہیں۔"
آریان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "مجھے ان فرسودہ القابات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف بابا کے کہنے پر جا رہا ہوں۔ وہ ایک احسان کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں، اور میں ان کا مان رکھنا چاہتا ہوں۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

دانیال نے کافی کا گھونٹ بھرا اور دل میں سوچا، "دیکھتے ہیں آریان صاحب، جب شہزادی سامنے آئے گی تو تمہارے یہ اصول کہاں جاتے ہیں۔"

حویلی کے پچھلے حصے میں، جہاں گھوڑوں کے اصطبل تھے، شاہ ویز اپنے پسندیدہ گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت اور حسد تھا۔ وہ چوہدری حشمت کا دور کا بھتیجا تھا اور برسوں سے اس انتظار میں تھا کہ ایک دن اس حویلی کا وارث بنے گا اور عنایہ اس کی ہوگی۔

"سنا ہے شہر سے کوئی مہمان آ رہا ہے؟" شاہ ویز نے اپنے ملازم سے پوچھا، اس کے لہجے میں زہر تھا۔

"جی صاحب، افتخار صاحب کا بیٹا آ رہا ہے۔ کہتے ہیں چوہدری صاحب اسے اپنی بیٹی کا محافظ بنانا چاہتے ہیں،" ملازم نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

شاہ ویز کے ہاتھ میں پکڑا ہوا برش زور سے گھوڑے کی پیٹھ پر لگا۔ "محافظ؟ اس حویلی کا محافظ صرف شاہ ویز ہے۔ جو بھی باہر سے آئے گا، اسے یہاں کی مٹی میں دفن ہونا پڑے گا۔" اس نے دانت پیستے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔
گاؤں کی کچی سڑکوں پر ایک چمچماتی کالی گاڑی دھول اڑاتی ہوئی حویلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آریان ڈرائیونگ سیٹ پر تھا، اس کی نظریں سڑک پر جمی تھیں مگر ذہن میں ہزاروں سوالات تھے۔
جب گاڑی حویلی کے بڑے پھاٹک کے اندر داخل ہوئی تو پورے گاؤں میں جیسے ایک خبر پھیل گئی۔ چوہدری صاحب نے خود آگے بڑھ کرآریان کے دوست اور آریان کا استقبال کیا۔
"خوش آمدید آریان بیٹا! تم تو بالکل اپنے باپ پر گئے ہو، وہی وقار، وہی تمکنت،" چوہدری

حشمت نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔
آریان نے ادب سے سلام کیا، مگر اس کی نظریں حویلی کی در و دیوار کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے یہ سب ایک خوبصورت قید خانہ لگ رہا تھا۔
اوپر بالکونی میں، عنایہ اور اس کی سہیلی زویا پردے کے پیچھے چھپی نیچے کا منظر دیکھ رہی تھیں۔
"ہائے اللہ! عنایہ، یہ تو واقعی بہت ہینڈسم ہے،" زویا نے دبی دبی آواز میں کہا۔ "لیکن دیکھو تو کتنا سڑیل لگ رہا ہے، ایک بار بھی نہیں مسکرایا۔"
عنایہ خاموش تھی۔ اس کی نظریں آریان پر جمی تھیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس اجنبی کے آنے سے حویلی کی ہواؤں میں کوئی تبدیلی آ گئی ہے۔ آریان نے اچانک سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے عنایہ کی نظریں اس کی گہری اور سنجیدہ آنکھوں سے

ٹکرائیں، اور اسے لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن ایک پل کے لیے رک گئی ہو۔
وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی اور کمرے کے اندر بھاگ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز تھی اور چہرے پر حیا کی سرخی۔
نیچے کھڑے آریان کے لبوں پر ایک مبہم سی لکیر ابھری۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ "شہزادی" اس کی زندگی کے تمام اصولوں کو ایک دن پاش پاش کر دے گی۔
رات کے کھانے کے بعد، جب ستارے آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے، دادی جان نے آریان کو اپنے پاس بلایا۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے مگر ان کی آواز میں ایک خاص قوت تھی۔
"بیٹا! اس گھر کی بنیادیں صرف اینٹوں پر نہیں، جذبوں پر کھڑی ہیں۔ یہاں شہزادیاں محلوں میں نہیں، دلوں میں رہتی ہیں۔ کیا تم اس دل کی حفاظت کر پاؤ گے جس کی چابی

تمہارے ہاتھ میں دی جا رہی ہے؟"
آریان خاموش رہا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، لیکن اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ سفر جتنا اس نے سوچا تھا، اس سے کہیں زیادہ لمبا اور کٹھن ہونے والا ہے۔
دادی جان کی باتوں نے آریان کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ رات بھر حویلی کے مہمان خانے کے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اسے لگا جیسے دیواروں پر لگی پرانی تصویریں اسے گھور رہی ہوں۔ اس نے کھڑکی کھولی تو باہر رات کی خاموشی میں دور کہیں گیدڑوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، جو گاؤں کی زندگی کا ایک خاصہ تھیں۔
اگلی صبح، حویلی میں چہل پہل ذرا جلدی شروع ہو گئی۔ بیگم زبیدہ نے ناشتے کے لیے خاص اہتمام کیا تھا۔ مکھن، لسی، پراٹھے اور دیسی انڈوں کی خوشبو پورے دالان میں پھیلی ہوئی تھی۔

عنایہ باورچی خانے میں اپنی والدہ کی مدد کر رہی تھی، مگر اس کا ذہن کل کی اس ادھوری نظر پر اٹکا ہوا تھا۔
"عنایہ! ذرا یہ لسی کا جگ باہر میز پر رکھ آؤ،" بیگم زبیدہ نے کہا۔
عنایہ نے دوپٹہ سر پر ٹھیک کیا اور احتیاط سے جگ اٹھا کر باہر نکلی۔ صحن میں دھوپ پھیل چکی تھی۔ جیسے ہی وہ ڈائننگ ٹیبل کے قریب پہنچی، اسے احساس ہوا کہ وہاں کوئی پہلے سے موجود ہے۔
آریان اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی اور کندھوں پر کالی چادر ڈال رکھی تھی۔ عنایہ کو دیکھ کر اس نے اخبار ایک طرف رکھا۔ عنایہ نے نظریں جھکا کر جگ میز پر رکھا اور واپس مڑنے لگی کہ آریان کی آواز نے اسے روک دیا۔
"سنا ہے آپ کو 'شہزادی' پکارا جاتا ہے؟" آریان کا لہجہ سپاٹ تھا، نہ اس میں طنز تھا نہ ہی

تعریف۔
عنایہ رک گئی۔ اس نے دھیرے سے سر اٹھایا۔ "جی، بابا پیار سے کہتے ہیں۔"
"القابات انسان کو مغرور بنا دیتے ہیں،" آریان نے سردی سے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ آپ اس نام کے بوجھ تلے اپنی حقیقت نہیں بھولیں گی۔"
عنایہ کو اس کی بات چبھی۔ اس نے پہلی بار آریان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا، "نام بوجھ تب بنتے ہیں جب وہ کمائے نہ گئے ہوں۔ میرے لیے یہ نام میرے باپ کی محبت ہے۔ اور محبت کبھی بوجھ نہیں ہوتی۔"
آریان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت کی لہر دوڑی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ یہ معصوم سی نظر آنے والی لڑکی اتنی خود اعتمادی سے جواب دے گی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ زویا ہنستی ہوئی وہاں آگئی۔
"ارے واہ! یہاں تو صبح صبح ہی بحث شروع

ہو گئی؟" زویا نے شرارت سے آریان کو دیکھا۔
"آریان صاحب! ہماری شہزادی سے ذرا بچ کر، یہ جتنا میٹھا بولتی ہیں، ان کے پاس الفاظ کے اتنے ہی تیر بھی ہیں۔"
آریان نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ دبائی اور خاموش ہو گیا۔
اسی دوران، حویلی کے باہر والے حصے میں شاہ ویز اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ آریان کی گاڑی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔
"صاحب! یہ شہر کا لڑکا تو یہیں ڈیرے ڈال کر بیٹھ گیا ہے،" اس کے ایک کارندے نے اکسایا۔
شاہ ویز نے اپنی جیب سے ایک تیز دھار چاقو نکالا اور گاڑی کے ٹائر کے قریب لے گیا۔ "ڈیرے ڈالنا آسان ہے، لیکن یہاں قدم ٹکائے رکھنا مشکل۔ اسے لگ رہا ہے کہ چوہدری صاحب کی چھتر چھایا اسے بچا لے گی، لیکن اسے نہیں معلوم کہ اس گاؤں کی راتیں کتنی خطرناک ہوتی ہیں۔"

اس نے چاقو کی نوک سے ٹائر پر ایک نشان لگایا، مگر اسے کاٹا نہیں۔ "ابھی نہیں... ابھی تو اسے یہ احساس دلانا ہے کہ وہ یہاں مہمان نہیں، بلکہ ایک قیدی بن کر آیا ہے۔"

دوپہر کے وقت چوہدری حشمت نے آریان کو اپنے ساتھ گھوڑوں کے اصطبل کی طرف چلنے کو کہا۔ وہاں افتخار احمد بھی موجود تھے۔

"آریان بیٹا! یہ گھوڑا دیکھ رہے ہو؟ یہ میرا سب سے وفادار جانور ہے۔ اس نے کئی بار میری جان بچائی ہے،" چوہدری صاحب نے ایک طاقتور کالے گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اسی طرح وفاداری کا ثبوت دو۔ کل سے تم عنایہ کے ساتھ اس کے کالج جاؤ گے اور اسے واپس لاؤ گے۔"

آریان حیران رہ گیا۔ "لیکن بابا! میں یہاں بزنس کے سلسلے میں بات کرنے آیا تھا، باڈی گارڈ بننے نہیں۔"

افتخار احمد نے سختی سے کہا، "آریان! چوہدری صاحب کی بات کا مطلب حکم ہوتا ہے۔ اور یاد رکھو، عنایہ صرف ان کی بیٹی نہیں، وہ تمہاری ذمہ داری ہے۔"

آریان نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے گرد ایک جالا بنا جا رہا ہے جس سے نکلنا اب ممکن نہیں تھا۔ اس نے دور بالکونی کی طرف دیکھا جہاں عنایہ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

سورج اب مکمل طور پر ڈھل چکا تھا اور حویلی کے بلند میناروں پر لگی لالٹینیں روشن ہو چکی تھیں۔ آریان اپنے والد کی بات سن کر ساکت کھڑا تھا۔ اسے اپنی آزادی چھنتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، لیکن چوہدری حشمت کی آنکھوں میں موجود لرزتی ہوئی امید نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔

"ٹھیک ہے بابا، اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو کل سے میں ہی انہیں کالج چھوڑنے جاؤں گا،"

آریان نے دھیمی مگر پُرعزم آواز میں کہا۔
چوہدری صاحب کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ "جیتا رہ پترا! مجھے پتہ تھا افتخار کا بیٹا مجھے مایوس نہیں کرے گا۔"
رات کے پچھلے پہر، جب حویلی کے زیادہ تر چراغ گل ہو چکے تھے، شاہ ویز اپنے کمرے میں کھڑا کھڑکی سے باہر مہمان خانے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانی شکاری بندوق تھی جسے وہ بڑے غور سے صاف کر رہا تھا۔
"آریان... تم نے یہاں آ کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے،" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اس کا دوست اور وفادار کارندہ 'جیدا' کمرے میں داخل ہوا۔
"صاحب! کل صبح وہ شہزادی کو لے کر شہر والے کالج جائے گا۔ راستے میں نہر والا پل آتا ہے، وہاں آبادی کم ہے،" جیدے نے سرگوشی کی۔
شاہ ویز کے لبوں پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ

آئی۔ "پل پر گاڑی روکنا مشکل نہیں ہے۔ اسے صرف ڈرانا نہیں ہے، اسے یہ بتانا ہے کہ اس مٹی کا مالک کون ہے۔ شہزادی میری ہے، اور جو میری چیز کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے، میں وہ ہاتھ کاٹنا جانتا ہوں۔"

اسی وقت، عنایہ اپنے کمرے میں بیٹھی ڈائری لکھ رہی تھی۔ اس کی بہترین دوست زویا بستر پر لیٹی اسے چھیڑ رہی تھی۔

"عنایہ! سچ سچ بتا، تجھے آریان کی وہ سنجیدگی اچھی لگی نا؟ دیکھنا، وہ کل جب گاڑی چلائے گا اور تم اس کے ساتھ بیٹھی ہوگی، تو پورا کالج دیکھے گا،" زویا نے شرارت سے کہا۔

عنایہ نے قلم روکا اور ایک لمبا سانس لیا۔ "زویا، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ وہ بہت غصے والے لگتے ہیں۔ اور شاہ ویز... تم تو جانتی ہو وہ کتنا ضدی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آریان صاحب کی جان کو خطرہ نہ ہو جائے۔"

"ارے پاگل! آریان شہر کا ہے تو کیا ہوا، اس کے باپ نے اسے شیر بنایا ہے۔ تو بس اپنی پڑھائی پر دھیان دے،" زویا نے اسے حوصلہ دیا، لیکن عنایہ کا دل کسی ان جانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔

صبح کے چھ بجے تھے جب آریان نے اپنی گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور پرندے چہچہا رہے تھے۔ عنایہ اپنے بیگ کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اتری۔ اس نے سفید رنگ کا لباس پہنا تھا اور سر پر بڑا سا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا، جو اس کی شخصیت میں ایک وقار پیدا کر رہا تھا۔ بیگم زبیدہ نے عنایہ کی پیشانی چومی اور آریان کی طرف دیکھ کر کہا، "بیٹا! میری جان تمہارے حوالے ہے۔ اسے سنبھال کر لے جانا۔" آریان نے خاموشی سے سر ہلایا اور گاڑی کا دروازہ کھولا۔ عنایہ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے لگی تو آریان نے رک کر اسے دیکھا۔

"آپ آگے بیٹھیں،" اس نے مختصر کہا۔
عنایہ ہچکچائی۔ "لیکن آریان صاحب..."
"میں آپ کا ڈرائیور نہیں ہوں، محافظ ہوں۔
اور محافظ کو اپنے ساتھی کی حرکات و
سکنات پر نظر رکھنی ہوتی ہے۔ آگے بیٹھیں،"
آریان کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔
عنایہ خاموشی سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔
گاڑی حویلی کے بھاری پھاٹک سے باہر نکلی
اور کچی سڑک پر دوڑنے لگی۔ راستے بھر
خاموشی رہی، صرف انجن کی آواز سنائی دے
رہی تھی۔
تقریباً آدھے گھنٹے بعد، جب گاڑی نہر کے
قریب پہنچی، آریان نے دیکھا کہ سڑک کے
بیچوں بیچ ایک بڑا سا درخت گرا ہوا ہے جس
نے راستہ بلاک کر دیا تھا۔ اس نے فوراً بریک
ماری۔
"کیا ہوا؟" عنایہ نے گھبرا کر پوچھا۔
"راستہ بند ہے۔ آپ اندر ہی رہیں اور دروازے

لاک کر لیں،" آریان نے سختی سے ہدایت دی
اور گاڑی سے باہر نکلا۔
جیسے ہی وہ گاڑی سے باہر آیا، جھاڑیوں کے
پیچھے سے پانچ چھ نقاب پوش افراد نکل
آئے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور کلہاڑیاں
تھیں۔ ان کے پیچھے شاہ ویز کا قریبی آدمی
جیدا کھڑا تھا۔
"اوئے شہر کے بابو! گاڑی کی چابی ہمیں دے
اور پیدل واپس نکل جا، ورنہ تیری لاش بھی
کسی کو نہیں ملے گی،" جیدا نے دھمکی دی۔
عنایہ نے گاڑی کے اندر سے یہ منظر دیکھا تو
اس کی چیخ نکل گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر
ہاتھ نکال کر آریان کو روکنا چاہا، "آریان
صاحب! اندر آ جائیں، یہ لوگ بہت خطرناک
ہیں!"
لیکن آریان کے چہرے پر ذرا بھی خوف نہیں
تھا۔ اس نے اپنی قمیض کی آستینیں اوپر
چڑھائیں اور ایک ٹھنڈی مسکراہٹ کے ساتھ

بولا، "میں نے سنا تھا گاؤں کے لوگ مہمان نواز ہوتے ہیں، پر آپ لوگ تو راستہ روک کر بیٹھ گئے ہیں۔ چلو، دیکھتے ہیں کس میں کتنا دم ہے۔"

جیدے نے اشارہ کیا اور سب غنڈے ایک ساتھ آریان پر جھپٹ پڑے۔ آریان نے بڑی چستی سے پہلے وار کو روکا اور ایک زوردار گھونسا ایک کے جبڑے پر جڑا۔ لڑائی شدید ہو گئی تھی۔ عنایہ گاڑی کے اندر بیٹھی کانپ رہی تھی اور اللہ سے دعا کر رہی تھی۔

اسی وقت دور سے ایک اور گاڑی آتی دکھائی دی۔ وہ شاہ ویز کی جیپ تھی۔ وہ یہ منظر دیکھ کر اپنی فتح کا جشن منانا چاہتا تھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ آریان اکیلا ان پانچوں پر بھاری پڑ رہا ہے، تو اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

آریان نے آخری غنڈے کو زمین پر پچھاڑا اور جیدے کے قریب جا کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"اپنے مالک سے کہنا، شہزادیاں محلوں میں محفوظ رہتی ہیں، پر ان کے محافظ میدانِ جنگ میں تیار ہوتے ہیں۔"

اس نے جیدے کو دھکا دیا اور واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ماتھے پر ایک چھوٹا سا زخم تھا جس سے خون رس رہا تھا۔ عنایہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے اپنا رومال نکال کر آریان کی طرف بڑھایا۔ "آپ کو چوٹ لگی ہے۔"

آریان نے رومال نہیں لیا، صرف گاڑی اسٹارٹ کی اور درخت کے پاس سے راستہ بناتے ہوئے آگے نکل گیا۔ "یہ تو بس شروعات ہے عنایہ صاحبہ۔ ابھی تو بہت سے راستے صاف کرنے باقی ہیں۔"

گاڑی کالج کے سامنے رکی۔ عنایہ اتری، مگر اس بار اس کی نظروں میں آریان کے لیے صرف اجنبیت نہیں تھی، بلکہ ایک عجیب سا احترام اور احساسِ تحفظ تھا۔ وہ مڑ کر کالج کے اندر

جانے لگی، تو آریان نے اسے پکارا۔
"شہزادی صاحبہ!"
عنایہ رکی۔
"دو بجے میں یہیں ہوں گا۔ دیر مت کیجیے گا،" آریان نے اپنی گہری آنکھوں سے اسے دیکھا۔
عنایہ نے دھیرے سے سر ہلایا اور اندر چلی گئی۔ آریان نے گاڑی کا شیشہ اوپر کیا اور اپنی زخمی پیشانی کو آئینے میں دیکھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ شاہ ویز اسے اتنی آسانی سے جینے نہیں دے گا، مگر اب یہ جنگ صرف چوہدری صاحب کے وعدے کی نہیں تھی، اب یہ اس کے اپنے وقار کی جنگ بن چکی تھی
کالج کی گھنٹی بجی تو عنایہ کا دل ابھی تک صبح کے اس خوفناک منظر پر اٹکا ہوا تھا۔ اسے بار بار آریان کا وہ پُر اعتماد چہرہ اور اس کا وہ لہجہ یاد آ رہا تھا جس میں ذرا بھی

لرزش نہیں تھی۔ وہ اپنی کلاس میں بیٹھی تھی لیکن اس کی نظریں کھڑکی سے باہر سڑک پر جمی تھیں، جہاں آریان کی کالی گاڑی کسی خاموش پہرے دار کی طرح کھڑی تھی۔

"عنایہ! تم کہاں کھوئی ہوئی ہو؟ میڈم نے تین بار تمہارا نام پکارا ہے،" زویا نے اسے ٹوکا۔

"اوہ! معذرت زویا، بس کچھ پریشان ہوں،" عنایہ نے ہڑ بڑا کر جواب دیا۔

"وہی صبح والا واقعہ؟ دیکھو عنایہ، آریان نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ واقعی تمہارا محافظ بن سکتا ہے۔ شاہ ویز کے غنڈوں کو جس طرح اس نے دھول چٹائی ہے، پورے گاؤں میں اس کے چرچے ہو رہے ہیں،" زویا نے دبی دبی آواز میں کہا۔

عنایہ خاموش رہی۔ اسے شاہ ویز کی فطرت کا پتہ تھا۔ وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

دوسری طرف – شاہ ویز کا غصہ:
گاؤں سے باہر ایک ویران ڈیرے پر شاہ ویز غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے سامنے رکھی بوتل اٹھا کر دیوار پر دے ماری۔ جیدا سر جھکائے کھڑا تھا، اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور ہاتھ پر پٹی بندھی تھی۔
"تم پانچ لوگ مل کر بھی اس ایک شہر کے لڑکے کا کچھ نہیں بگاڑ سکے؟" شاہ ویز دھاڑا۔
"وہ کوئی معمولی لڑکا نہیں ہے، وہ تو جنگلی لگ رہا تھا۔"
"صاحب! ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنا پھرتیلا ہوگا۔ اس نے تو ہمیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا،" جیدے نے ہکلاتے ہوئے کہا۔
شاہ ویز نے اپنی بندوق اٹھائی اور اس کی نالی پر ہاتھ پھیرا۔ "اب سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔ چوہدری حشمت نے اسے بلایا ہے نا؟ تو اب چوہدری صاحب کو ہی بتانا پڑے گا کہ انہوں نے کتنا بڑا جوا کھیلا ہے۔

میں عنایہ کو اس سے چھین کر رہوں گا، چاہے مجھے حویلی کو آگ ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔"
دو بجے جب کالج کی چھٹی ہوئی، عنایہ باہر نکلی تو آریان گاڑی کے پاس کھڑا فون پر بات کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر آریان نے فون جیب میں رکھا اور خاموشی سے دروازہ کھول دیا۔
گاڑی میں بیٹھتے ہی عنایہ نے دیکھا کہ آریان کے ماتھے پر لگا زخم اب نیلا پڑ چکا تھا۔ اس نے ہمت جمع کی اور دھیمی آواز میں پوچھا،
"آپ کو... درد تو ہو رہا ہوگا؟"
آریان نے ایک لمحے کے لیے اسے آئینے میں دیکھا۔ "درد جسم کو ہوتا ہے عنایہ صاحبہ، ضمیر کو نہیں۔ میرا کام آپ کو بحفاظت پہنچانا تھا، اور میں نے وہ کیا۔"
"لیکن آپ نے اپنی جان خطرے میں ڈالی۔ شاہ ویز بہت خطرناک انسان ہے، وہ پیٹھ پیچھے وار کرتا ہے،" عنایہ کی آواز میں فکر صاف جھلک رہی تھی۔

آریان نے گاڑی کی رفتار بڑھائی۔ "خطروں سے کھیلنا میرا پرانا مشغلہ ہے۔ آپ بس اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔ باقی معاملات میں خود دیکھ لوں گا۔"

اچانک آریان نے گاڑی ایک چھوٹے سے میڈیکل اسٹور کے سامنے روک دی۔ "دو منٹ رکیں، پٹی بدلنی ہے۔"

وہ باہر نکلا، لیکن اس کی چال میں ایک عجیب سی لنگڑاہٹ تھی جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عنایہ سے رہا نہ گیا۔ وہ بھی گاڑی سے باہر نکل آئی۔

"لائیں، میں مدد کرتی ہوں،" عنایہ نے اس کے ہاتھ سے روئی اور دوائی لیتے ہوئے کہا۔

آریان پہلے تو ہچکچایا، پھر ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ عنایہ نے بہت احتیاط سے اس کے زخم کو صاف کیا۔ دونوں کے درمیان خاموشی تھی، لیکن اس خاموشی میں ہزاروں لفظ چھپے تھے۔ عنایہ کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور آریان

کی نظریں اس کے معصوم چہرے پر جمی تھیں۔
"آپ کا نام 'شہزادی' بالکل ٹھیک ہے،" آریان نے اچانک کہا۔
عنایہ نے حیرت سے دیکھا۔ "کیوں؟"
"کیونکہ شہزادیاں دوسروں کا درد بانٹنا جانتی ہیں،" آریان کے لہجے میں پہلی بار تھوڑی سی نرمی آئی تھی۔
جب وہ حویلی پہنچے، تو وہاں کا ماحول بدلا ہوا تھا۔ چوہدری حشمت اور افتخار احمد برآمدے میں بیٹھے کسی گہری سوچ میں تھے۔ شاہ ویز کے والد (جو چوہدری صاحب کے بھائی تھے) بھی وہاں موجود تھے اور غصے میں اونچی آواز میں بات کر رہے تھے۔
"حشمت بھائی! یہ آپ نے کیا کیا؟ ایک باہر کے لڑکے کو اپنی بیٹی کا محافظ بنا دیا؟ اور اس نے میرے بیٹے کے آدمیوں پر ہاتھ اٹھایا؟"
چوہدری صاحب نے وقار سے جواب دیا،

"تمھارے بیٹے کے آدمی وہاں کیا کر رہے تھے؟ راستہ روک کر کسی کی بیٹی کو ہراساں کرنا کیا تمھارے نزدیک شرافت ہے؟"

اسی وقت آریان اور عنایہ اندر داخل ہوئے۔ سب کی نظریں ان پر پڑیں۔ آریان نے بڑے سکون سے سلام کیا اور اپنے والد کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

شاہ ویز کے والد نے آریان کو گھورا۔ "تمھاری ہمت کیسے ہوئی ہمارے علاقے میں غنڈہ گردی کرنے کی؟"

آریان نے مسکرا کر جواب دیا، "میں نے غنڈہ گردی نہیں کی، صرف صفائی کی ہے۔ اگر کچرا راستے میں پڑا ہو تو اسے ہٹانا پڑتا ہے۔"

یہ سن کر شاہ ویز کے والد تلملا اٹھے اور وہاں سے چلے گئے، لیکن جاتے جاتے ان کی نظریں ایک بڑی دشمنی کا پیغام دے رہی تھیں۔

رات کے کھانے کے بعد، دادی جان نے عنایہ کو اپنے پاس بلایا۔ ان کے کمرے میں پرانی لکڑی

کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک پرانا صندوق کھولا اور اس میں سے ایک سنہری زنجیر نکالی جس پر ایک چھوٹا سا لاکٹ تھا۔

"عنایہ پترا یہ لو، یہ تمہاری دادی کی امانت ہے۔ یاد رکھنا، اس حویلی کی دیواریں جتنا کچھ دکھاتی ہیں، اس سے کہیں زیادہ چھپاتی ہیں۔ آریان صرف ایک محافظ نہیں ہے، وہ تمہارے ماضی کا وہ حصہ ہے جو تم سے چھپا لیا گیا تھا۔"

عنایہ کے ہوش اڑ گئے۔ "ماضی؟ دادی جان، آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

دادی جان نے عنایہ کا ہاتھ تھاما۔ "وقت آنے پر سب پتہ چل جائے گا۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ شاہ ویز اور اس کا خاندان اس جائیداد کے لیے نہیں، بلکہ اس راز کے لیے لڑ رہے ہیں جو تمہارے اور آریان کے درمیان چھپا ہے۔"

عنایہ کمرے سے باہر نکلی تو اس کا سر چکرا

رہا تھا۔ وہ صحن میں آئی تو دیکھا کہ آریان وہاں اکیلا کھڑا چاند کو دیکھ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے آریان کے گرد بھی کوئی ایسا ہی ہالہ ہے جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی۔

اسی لمحے دور سے کسی گولی چلنے کی آواز آئی اور حویلی کے چوکیداروں نے شور مچا دیا۔ شاہ ویز نے اپنا دوسرا وار کر دیا تھا، لیکن اس بار نشانہ آریان نہیں، بلکہ حویلی کا وقار تھا۔

"آگ! آگ لگ گئی ہے پچھلے گودام میں!" کسی کے چلانے کی آواز آئی۔

آریان فوراً حرکت میں آیا۔ اس نے عنایہ کو دیکھا جو خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"اندر جائیں عنایہ! ابھی!"

وہ تیزی سے آگ کی طرف لپکا، لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ آگ صرف ایک دھوکہ ہے تاکہ اسے حویلی سے دور لے جایا جا سکے۔ شاہ ویز کے اصل نشانہ تو کوئی اور تھا

حویلی کے پچھلے گودام سے اٹھنے والے شعلے آسمان کو چھو رہے تھے۔ لکڑیوں کے جلنے کے کڑکڑانے کی آوازیں اور دھویں کے بادلوں نے چاند کی چاندنی کو گہرا کر دیا تھا۔ آریان تیزی سے اس طرف بھاگا، اس کے پیچھے دانیال اور حویلی کے چند ملازم بھی تھے۔

"پانی لاؤ! جلدی کرو، ورنہ یہ آگ اصطبل تک پہنچ جائے گی!" آریان کی آواز دھاڑ کی طرح گونجی۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر جلتی ہوئی لکڑیوں کے قریب پہنچ گیا اور بالٹیوں سے پانی ڈالنے لگا۔ اس کی سفید قمیض اب راکھ اور پسینے سے سیاہ ہو چکی تھی، مگر اس کے ارادے ہمالیہ سے بھی بلند تھے۔

حویلی کے اندرونی دالان میں

عنایہ صحن کے بیچوں بیچ ساکت کھڑی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بیگم زبیدہ اور دادی جان بھی باہر نکل آئی تھیں۔ پورے گھر میں افراتفری مچی ہوئی تھی،

چوکیدار باہر کی طرف بھاگ رہے تھے تاکہ آگ بجھانے میں مدد کر سکیں۔
اسی افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، حویلی کے عقبی راستے سے دو سائے تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ یہ شاہ ویز کے خاص آدمی تھے جنہوں نے اپنے چہروں پر ڈھانٹے باندھ رکھے تھے۔ ان کا مقصد آگ بجھانا نہیں، بلکہ اس خوف کا فائدہ اٹھا کر عنایہ تک پہنچنا تھا۔
"وہ رہی شہزادی! پکڑو اسے!" ایک نے سرگوشی کی۔
عنایہ نے مڑ کر دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ پیچھے ہٹنے لگی لیکن اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ زمین پر گر پڑی۔ "امی! دادی جان!" اس نے چیخ ماری، مگر اس کی آواز آگ کے شور میں دب گئی۔
ایک نقاب پوش نے عنایہ کا بازو پکڑ کر اسے کھینچنے کی کوشش کی کہ اچانک ایک بھاری بوٹ کی آواز سنائی دی اور ایک زوردار لات

اس نقاب پوش کے سینے پر لگی۔ وہ دور جا گرا۔
یہ آریان تھا۔ وہ آگ بجھاتے ہوئے اچانک رک گیا تھا کیونکہ اسے احساس ہوا کہ آگ صرف ایک 'ڈائی ورژن' (توجہ ہٹانے کا حربہ) ہو سکتی ہے۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خطرے کی بو سونگھ لی تھی اور وہ وقت پر واپس پہنچ گیا تھا۔
"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری موجودگی میں اس حویلی میں قدم رکھنے کی؟" آریان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔
اس نے دوسرے نقاب پوش کا گریبان پکڑا اور اسے دیوار کے ساتھ دے مارا۔ آریان کے مکے کسی ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ اس وقت وہ کوئی پڑھا لکھا شہری نوجوان نہیں، بلکہ ایک بپھرا ہوا شیر لگ رہا تھا جو اپنی 'شہزادی' کی حفاظت کر رہا تھا۔
نقاب پوشوں نے جب دیکھا کہ آریان ان کی

جان لے لے گا، تو وہ بدحواسی میں دیوار پھلانگ کر بھاگ گئے۔ آریان ان کے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن عنایہ کی سسکیوں نے اسے روک دیا۔

وہ تیزی سے عنایہ کے پاس آیا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ "آپ ٹھیک ہیں؟ چوٹ تو نہیں لگی؟" اس کے لہجے میں وہی نرمی لوٹ آئی تھی جو اس نے میڈیکل اسٹور پر دکھائی تھی۔

عنایہ نے کانپتے ہاتھوں سے آریان کی آستین پکڑ لی۔ "آریان صاحب... آپ کے ہاتھ سے خون نکل رہا ہے۔"

آریان نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا جو دیوار سے ٹکرانے کی وجہ سے زخمی ہو گیا تھا، مگر اس نے پروا نہیں کی۔ "یہ خون کچھ نہیں ہے۔ آپ اندر جائیں، اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔

رات کے اس ہنگامے کے بعد پورا گاؤں سکتے میں تھا۔ چوہدری حشمت کا چہرہ غصے سے

تمتما رہا تھا۔ انہوں نے پنچایت بلانے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن افتخار احمد نے انہیں روک دیا۔
"حشمت! یہ پنچایت کا معاملہ نہیں ہے۔ شاہ ویز کھلم کھلا جنگ پر اتر آیا ہے،" افتخار صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔
اسی وقت دادی جان برآمدے میں آئیں اور سب کو خاموش کروا دیا۔ "بہت ہو گیا! اب وقت آگیا ہے کہ وہ سچ بتا دیا جائے جو برسوں سے اس حویلی کی دیواروں میں دفن ہے۔"
سب کی نظریں دادی جان پر جم گئیں۔ عنایہ اور آریان بھی وہیں موجود تھے۔
دادی جان نے آریان کی طرف اشارہ کیا۔ "آریان صرف افتخار کا بیٹا نہیں ہے۔ یہ اس زمین کا وارث بھی ہے۔ حشمت! یاد کرو وہ دن جب تمہارے بڑے بھائی (جو شاہ ویز کے دادا تھے) نے دھوکے سے جائیداد بانٹی تھی؟ آریان کی دادی اسی خاندان کی بیٹی تھی جس کا حق

مارا گیا تھا۔ افتخار کو میں نے ہی شہر بھیجا تھا تاکہ وہ اپنے بیٹے کو اس دشمنی سے دور رکھ سکے، لیکن تقدیر اسے واپس لے آئی ہے۔"
یہ سن کر آریان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے لگا جیسے اس کی پوری شناخت بدل گئی ہو۔ وہ جس جاگیرداری نظام سے نفرت کرتا تھا، وہ خود اسی کا ایک حصہ تھا۔
عنایہ نے حیرت سے آریان کو دیکھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اجنبی نہیں تھے، ان کا رشتہ خون اور زمین سے جڑا ہوا تھا۔
ادھر شاہ ویز کو جب پتہ چلا کہ اس کا منصوبہ ناکام ہو گیا ہے اور آریان کا اصل رشتہ بھی سامنے آ رہا ہے، تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔
"تو وہ وارث بن کر آیا ہے؟" شاہ ویز نے اپنی جیپ کی چابی اٹھائی۔ "اب یہ کھیل جائیداد کا نہیں، زندگی کا ہے۔ اگر عنایہ میری نہیں ہو سکتی، تو وہ کسی کی نہیں ہوگی۔"

اس نے اپنے موبائل پر ایک میسج ٹائپ کیا اور کسی نامعلوم نمبر پر بھیج دیا: "تیار رہو، آج رات آخری دھماکہ ہوگا۔

حویلی کے باغ میں آریان اکیلا بیٹھا تھا۔ عنایہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

"آپ سچ میں چلے جائیں گے؟" اس نے دبی آواز میں پوچھا۔

آریان نے مڑ کر دیکھا۔ چاند کی روشنی عنایہ کے چہرے پر پڑ رہی تھی جس سے وہ واقعی کسی خواب کی شہزادی لگ رہی تھی۔ "میں یہاں صرف آپ کی حفاظت کے لیے آیا تھا عنایہ۔ لیکن اب مجھے پتہ چلا ہے کہ میری اپنی جڑیں بھی یہیں ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہاں رہنا میرے لیے خطرناک ہے، لیکن میرا ضمیر کہتا ہے کہ میں آپ کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

عنایہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "آپ کے بغیر یہ حویلی مجھے قید خانہ لگے گی۔"

آریان نے ہمت کر کے عنایہ کا ہاتھ تھاما۔ "میں وعدہ کرتا ہوں، جب تک میں زندہ ہوں، کوئی آپ کی مسکراہٹ نہیں چھین سکے گا۔"
ابھی وہ یہ بات کر ہی رہے تھے کہ اچانک حویلی کے باہر بہت سے لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں۔ شاہ ویز نے پورے گاؤں کے بدمعاشوں کو اکٹھا کر کے حویلی کا محاصرہ کر لیا تھا۔
"آریان! باہر نکلو!" شاہ ویز کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر گونجی۔ "اگر تم مرد ہو تو اکیلے سامنے آؤ، ورنہ میں اس حویلی کو بارود سے اڑا دوں گا!"
آریان نے عنایہ کا ہاتھ چھوڑا اور اپنی کمر سے پستول نکالا جو اس کے والد نے اسے دیا تھا۔ "وقت آگیا ہے عنایہ، اس کہانی کو انجام تک پہنچانے کا۔"
وہ تنہا حویلی کے بڑے پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا۔ پیچھے سے عنایہ کی چیخ سنائی دی،

"آریان! رک جائیں!" مگر آریان نہیں رکا۔ اسے معلوم تھا کہ آج کی رات یا تو وہ رہے گا، یا شاہ ویز کا ظلم
حویلی کے بھاری آہنی دروازے کے باہر مشعلوں کی روشنی ناچ رہی تھی۔ شاہ ویز اپنی جیپ پر سوار تھا، اس کے ہاتھ میں میگافون تھا اور ارد گرد بیس پچیس بپھرے ہوئے لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور دیسی ساختہ بندوقیں تھیں۔ فضا میں بارود اور دشمنی کی بو رچی ہوئی تھی۔
آریان جب قدم بقدم چلتا ہوا پھاٹک کے قریب پہنچا، تو اس کے پیچھے دانیال بھی اپنی پستول تھامے آ کھڑا ہوا۔
"آریان! پاگل مت بنو، یہ لوگ جان لینے پر تلے ہوئے ہیں،" دانیال نے سرگوشی کی۔
آریان نے پیچھے مڑے بغیر جواب دیا، "دانیال، اگر آج میں پیچھے ہٹ گیا تو یہ حویلی اور اس کی 'شہزادی' کبھی سکون سے نہیں جی

سکیں گے۔ تم اندر رہو اور چوہدری صاحب کا خیال رکھو۔"
آریان نے پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھولا اور اکیلا باہر نکل آیا۔ جیسے ہی وہ مشعلوں کی روشنی کے دائرے میں داخل ہوا، شاہ ویز کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا۔
"آؤ شہر کے بابو! بڑے بہادر بنتے ہو نا؟" شاہ ویز جیپ سے نیچے اترا اور آریان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ "تمہیں لگا کہ دادی کی کہانیوں سے تم اس زمین کے وارث بن جاؤ گے؟ یہ زمین خون مانگتی ہے، اور آج وہ خون تمہارا ہوگا۔"
آریان نے سکون سے اپنی چادر کندھے سے اتار کر ایک طرف پھینکی۔ "شاہ ویز! تم زمین کی بات کرتے ہو، میں عزت کی بات کرتا ہوں۔ تم نے حویلی کی عورتوں کو ڈرایا ہے، اور ہمارے خاندان میں عورتوں کی بے حرمتی کرنے والے کو معافی نہیں ملتی۔"

"معافی؟" شاہ ویز زور سے ہنسا۔ "معافی تو تم مانگو گے جب میں تمہارے سامنے اس حویلی کو خاکستر کر دوں گا۔"
اس سے پہلے کہ شاہ ویز کچھ اور کہتا، آریان نے بجلی کی تیزی سے وار کیا۔ اس نے شاہ ویز کے ہاتھ سے میگافون چھین کر اسے دور پھینکا اور ایک بھرپور مکہ اس کے جبڑے پر جڑا۔ شاہ ویز لڑکھڑا کر پیچھے گرا، اور اسی کے ساتھ ہی اس کے آدمیوں نے آریان پر دھاوا بول دیا۔
اندرونی صحن میں عنایہ دیوانہ وار ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ باہر سے آنے والی گولیوں کی آوازیں اور چیخ و پکار اس کے کلیجے کو چیر رہی تھی۔ چوہدری حشمت اپنی پرانی رائفل نکال کر باہر جانے لگے تو افتخار احمد نے انہیں روک لیا۔
"نہیں حشمت! یہ نوجوانوں کی جنگ ہے۔ آریان نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں آپ کو

باہر نہیں جانے دوں گا،" افتخار صاحب کی
آواز میں دکھ اور فخر دونوں تھے۔
عنایہ بھاگتی ہوئی دادی جان کے پاس آئی۔
"دادی! کچھ کریں، وہ اکیلا ہے... وہ اسے مار
دیں گے۔"
دادی جان نے عنایہ کا سر اپنی گود میں رکھا۔
"پترا! جو حق کے لیے لڑتا ہے، اللہ اس کا
مددگار ہوتا ہے۔ آریان صرف اپنی جان کے لیے
نہیں، تمہارے مان کے لیے لڑ رہا ہے۔"
آریان اکیلا اتنے لوگوں سے لڑ رہا تھا۔ اس کے
ماتھے سے خون بہہ کر آنکھوں میں آ رہا تھا،
اس کی قمیض جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی،
مگر اس کے وار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔
اس نے ایک غنڈے سے لاٹھی چھینی اور اسے
اس مہارت سے گھمایا کہ کسی کو قریب آنے
کی ہمت نہ ہوئی۔
شاہ ویز نے جب دیکھا کہ اس کے آدمی پست
ہو رہے ہیں، تو اس نے جیب سے ایک چھوٹا سا

ریموٹ نکالا۔
"رک جاؤ!" شاہ ویز چلایا۔ سب رک گئے۔
"آریان! دیکھو میرے ہاتھ میں کیا ہے۔"
آریان نے ہانپتے ہوئے شاہ ویز کی طرف دیکھا۔
"حویلی کے پچھلے گودام میں جو آگ لگی تھی، وہ صرف آگ نہیں تھی۔ وہاں میں نے بارود کے دو ڈبے چھپائے تھے۔ اگر میں نے یہ بٹن دبایا، تو آدھی حویلی ملبے کا ڈھیر بن جائے گی... اور تمہاری شہزادی بھی اسی ملبے تلے دب جائے گی،" شاہ ویز کی آنکھوں میں جنون تھا۔
آریان کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ اس کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ "تم ایسا نہیں کرو گے شاہ ویز، وہ تمہارے اپنے خاندان کی بیٹی ہے۔"
"وہ میری نہیں تو کسی کی نہیں!" شاہ ویز نے انگوٹھا بٹن پر رکھا
عین اسی وقت جب شاہ ویز بٹن دبانے والا تھا، پیچھے سے ایک گولی چلی اور شاہ ویز

کے ہاتھ سے ریموٹ اڑ کر دور جا گرا۔ سب نے مڑ کر دیکھا تو وہاں پولیس کی گاڑیاں پہنچ چکی تھیں، جن کی قیادت دانیال کر رہا تھا جس نے خاموشی سے شہر سے پولیس منگوا لی تھی۔
شاہ ویز نے بھاگنے کی کوشش کی، لیکن آریان نے اسے دبوچ لیا۔ اس بار آریان نے کوئی رحم نہیں دکھایا۔ اس نے شاہ ویز کو اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔
"لے جاؤ اسے!" آریان نے پولیس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں ایک عجیب سی تھکن تھی۔
جب پولیس سب کو لے گئی اور خاموشی چھا گئی، تو آریان گھسیٹتے ہوئے قدموں کے ساتھ حویلی کے اندر داخل ہوا۔ صحن میں سب کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔
عنایہ نے جب آریان کو اس حال میں دیکھا— خون میں لت پت، تھکا ہوا مگر فاتح—تو وہ

اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور آریان کے سامنے آ کر رک گئی۔
آریان نے اسے دیکھا اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی۔ "میں نے کہا تھا نا... میں آپ کی مسکراہٹ چھننے نہیں دوں گا۔"
یہ کہہ کر آریان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس کے جسم کی ہمت جواب دے گئی تھی اور وہ عنایہ کے سامنے ہی گرنے لگا کہ عنایہ نے اسے سنبھال لیا۔
"آریان! آریان!" عنایہ کی چیخوں سے حویلی کی دیواریں گونج اٹھیں۔
آج کی رات ختم ہو چکی تھی، دشمنی مٹ چکی تھی، لیکن محبت اور قربانی کی ایک ایسی داستان شروع ہو چکی تھی جس کا دوسرا باب ابھی لکھا جانا باقی تھا
حویلی کے بڑے دالان میں ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی، مگر یہ وہ خاموشی

نہیں تھی جو خوف لاتی ہے، بلکہ یہ وہ خاموشی تھی جو کسی بڑے طوفان کے تھم جانے کے بعد آتی ہے۔ رات کا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا، شاہ ویز اور اس کے ساتھی پولیس کی حراست میں تھے، لیکن حویلی کے در و دیوار ابھی تک گولیوں کی آوازوں سے گونج رہے تھے۔

کمرے کے اندر، سفید بستر پر آریان بے ہوش لیٹا تھا۔ اس کے ماتھے پر سفید پٹی بندھی تھی اور بازو پر گہرا زخم تھا۔ شہر سے ڈاکٹر کو بلوایا گیا تھا جس نے اسے سکون آور انجکشن دیا تھا۔

عنایہ کمرے کے کونے میں بیٹھی ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، جیسے وہ رات بھر سوئی نہ ہو۔ اس کے ہاتھ میں وہی سنہری لاکٹ تھا جو دادی جان نے اسے دیا تھا۔ اسے بار بار آریان کے وہ آخری الفاظ یاد آ رہے تھے: "میں

آپ کی مسکراہٹ چھننے نہیں دوں گا۔"
"عنایہ پترا! جاؤ کچھ کھا لو، تم نے کل سے کچھ نہیں چکھا،" بیگم زبیدہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
"نہیں امی! جب تک یہ ہوش میں نہیں آ جاتے، مجھے کچھ اچھا نہیں لگے گا،" عنایہ کی آواز بھرا گئی تھی۔ "یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ اگر میں نہ ہوتی تو شاہ ویز ان کی جان لینے کے پیچھے نہ پڑتا۔"
"پاگل مت بنو،" بیگم زبیدہ نے اسے گلے لگایا۔ "یہ تقدیر کے لکھے ہوئے فیصلے ہیں۔ آریان نے ثابت کر دیا کہ وہ اس گھر کا صرف محافظ نہیں، بلکہ اس کا حصہ ہے۔"
دوسری طرف، شہر کے تھانے کے ایک اندھیرے لاک اپ میں شاہ ویز سلاخوں کے پیچھے کھڑا غصے سے پھنکار رہا تھا۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور لباس تار تار تھا۔
"صاحب! چوہدری حشمت نے کیس بہت

مضبوط بنایا ہے۔ ہمیں بیل (Bail) ملنا مشکل ہے،" جیدے نے ایک کونے میں دبک کر کہا۔
شاہ ویز نے سلاخوں پر زور سے مکا مارا اور قہقہہ لگایا۔ "بیل؟ مجھے بیل کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس وہ مہرہ ہے جو آریان کو خود یہاں آ کر مجھے رہا کرنے پر مجبور کرے گا۔"
"کون سا مہرہ صاحب؟"
شاہ ویز کی آنکھوں میں شیطانی چمک آئی۔
"آریان کے ماضی کا وہ کاغذ... جو میرے باپ نے برسوں پہلے افتخار احمد سے چھینا تھا۔
وہ کاغذ جس پر لکھا ہے کہ آریان کے اصل والدین کون تھے اور وہ اس حویلی میں کیسے آئے۔"
دوپہر کے وقت جب سورج کی تپش کم ہوئی، آریان نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اسے اپنا سر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے کھڑکی سے دھوپ کی ایک

لکیر کمرے میں آ رہی تھی اور وہیں عنایہ سر جھکائے تسبیح پڑھ رہی تھی۔
"پانی..." آریان کے لبوں سے دھیمی سی آواز نکلی۔
عنایہ بجلی کی تیزی سے اٹھی اور پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ "آرام سے... آہستہ پیجئے گا۔"
آریان نے پانی پیا اور عنایہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش اور انسیت کا ایک سمندر تھا۔
"آپ ٹھیک ہیں؟" آریان نے پوچھا۔
عنایہ کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپک کر آریان کے ہاتھ پر گرا۔ "میں ٹھیک ہوں، لیکن آپ نے یہ سب کیوں کیا؟ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر پاتی۔"
آریان نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر زخم کی وجہ سے کراہ اٹھا۔ "میں نے کہا تھا نا... شہزادیوں کو

رونا زیب نہیں دیتا۔ اور پھر، میرا فرض ابھی پورا نہیں ہوا۔"

عنایہ نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ اسی وقت دانیال کمرے میں داخل ہوا۔

"اوئے ہیرو! ہوش آگیا؟ پورے گاؤں میں تیرے چرچے ہیں۔ اب تو چوہدری صاحب نے اعلان کر دیا ہے کہ آریان ہی اس علاقے کا نیا 'نگران' ہوگا،" دانیال نے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔

آریان نے سنجیدگی سے کہا، "دانیال، شاہ ویز کو ہلکا مت لینا۔ وہ جیل سے بھی وار کر سکتا ہے۔"

اگلے چند دن حویلی میں سکون رہا۔ آریان آہستہ آہستہ صحتیاب ہو رہا تھا۔ وہ اب حویلی کے باغ میں عنایہ کے ساتھ چہل قدمی کرنے لگا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ایک ان کہی محبت پروان چڑھ رہی تھی جو لفظوں کی محتاج نہیں تھی۔

ایک شام، جب آریان اکیلا برآمدے میں بیٹھا تھا، ایک نامعلوم شخص حویلی کے پھاٹک پر آیا اور ایک لفافہ آریان کے نام دے کر غائب ہو گیا۔

آریان نے لفافہ کھولا تو اس کے اندر ایک پرانی تصویر تھی اور ایک خط۔ تصویر میں آریان کے والد افتخار احمد ایک اجنبی عورت کے ساتھ کھڑے تھے، اور خط میں لکھا تھا:

"آریان! جس باپ کو تم اپنا آئیڈیل مانتے ہو، اس نے تم سے تمہاری اصل حقیقت چھپائی ہے۔ اگر جاننا چاہتے ہو کہ تم کون ہو اور تمہارا اس حویلی سے کیا رشتہ ہے، تو آج رات اکیلے پرانی نہر والے ڈیرے پر آؤ۔ اگر کسی کو بتایا، تو یہ سچ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گا۔"

— ایک خیر خواہ

آریان کا دماغ گھوم گیا۔ اسے دادی جان کی باتیں یاد آنے لگیں کہ اس کا ماضی اس حویلی سے جڑا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ

سچ جان کر رہے گا، چاہے اس کے لیے اسے
دوبارہ خطرے میں کیوں نہ پڑنا پڑے۔
رات کے وقت، جب سب سو گئے، آریان نے
چپکے سے اپنی گاڑی نکالی اور پرانی نہر کی
طرف روانہ ہوا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ پیچھے
سے عنایہ نے اسے جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور
وہ بھی فکر مند ہو کر زویا کے ساتھ دوسری
گاڑی میں اس کے پیچھے نکل پڑی تھی۔
نہر والے ویران ڈیرے پر صرف ایک لالٹین جل
رہی تھی۔ آریان جیسے ہی وہاں پہنچا،
اندھیرے سے ایک شخص برآمد ہوا۔ وہ شاہ
ویز کا وکیل تھا۔
"آریان صاحب! آپ آگئے۔ یہ لیجئے وہ
کاغذات،" وکیل نے ایک فائل اس کی طرف
بڑھائی۔ "لیکن ایک شرط ہے... آپ کو شاہ ویز
کے خلاف اپنا بیان واپس لینا ہوگا۔"
آریان نے فائل جھپٹ لی اور اسے پڑھنا شروع
کیا۔ جیسے جیسے وہ پڑھ رہا تھا، اس کے

چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔ اس فائل میں لکھا تھا کہ آریان دراصل چوہدری حشمت کے بڑے بھائی کا بیٹا ہے، جسے دشمنی سے بچانے کے لیے افتخار احمد نے گود لے لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ آریان اور عنایہ آپس میں کزن تھے، اور اس حویلی کا اصل وارث آریان ہی تھا۔

"تو یہ سچ ہے..." آریان کی آواز لرز رہی تھی۔ اسی وقت شاہ ویز کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا۔ "سچ تو تم نے جان لیا، اب یہ سچ تمہارے ساتھ ہی قبر میں جائے گا۔"

اچانک پیچھے سے گاڑی کی ہیڈلائٹس روشن ہوئیں۔ عنایہ اور زویا وہاں پہنچ چکی تھیں۔ "رک جاؤ!" عنایہ گاڑی سے باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ میں اس کے بابا کی لائسنس یافتہ پستول تھی۔ "آریان کو ہاتھ بھی لگایا تو میں گولی چلا دوں گی!"

شاہ ویز کے آدمی رک گئے۔ آریان نے حیرت سے

عنایہ کی طرف دیکھا، جو آج واقعی ایک نڈر شہزادی لگ رہی تھی۔
"عنایہ! تم یہاں کیوں آئی ہو؟" آریان چلایا۔
"کیونکہ میں آپ کو دوبارہ کھونا نہیں چاہتی،" عنایہ نے بلند آواز میں کہا۔
اسی لمحے پولیس کے سائرن دور سے سنائی دیے۔ دانیال نے ایک بار پھر وقت پر کارروائی کر دی تھی۔ شاہ ویز کے کارندے بھاگ کھڑے ہوئے، مگر آریان کے ہاتھ میں موجود وہ فائل اب سب کچھ بدلنے والی تھی۔
آریان نے عنایہ کی طرف دیکھا۔ "عنایہ، اب سب کچھ بدل جائے گا۔ میں وہ نہیں ہوں جو میں سمجھتا تھا۔"
عنایہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ جو بھی ہوں، میرے وہی آریان ہیں جنہوں نے میرے لیے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔"
لیکن آریان جانتا تھا کہ یہ انکشاف چوہدری حشمت کے لیے ایک بہت بڑا جھٹکا ہوگا، اور

شاید شاہ ویز اسی بات کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا

رات کے اس سناٹے میں نہر کے کنارے کھڑی گاڑیوں کی ہیڈلائٹس نے ماحول کو ایک عجیب سی ہیبت دے دی تھی۔ آریان کے ہاتھ میں موجود وہ فائل کسی جلتے ہوئے انگارے کی طرح تھی، جس نے اس کی پوری زندگی کے سچ کو خاکستر کر دیا تھا۔ عنایہ اب بھی پستول تھامے کھڑی تھی، اس کی سانسیں تیز تھیں اور آنکھوں میں آریان کو کھو دینے کا خوف صاف نظر آ رہا تھا۔

پولیس کی گاڑیاں قریب پہنچ رہی تھیں، اور شاہ ویز کے کارندے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر جھاڑیوں میں روپوش ہو چکے تھے۔ آریان نے دھیرے سے قدم بڑھایا اور عنایہ کے ہاتھ سے پستول لے کر اسے نیچے کیا۔

"عنایہ... تم نے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی؟" آریان کی آواز میں دکھ اور اپنائیت کی

ایک لہر تھی۔
"کیونکہ آپ میری جان ہیں آریان!" عنایہ نے بنا سوچے سمجھے کہہ دیا، اور پھر خود ہی اپنی بات پر شرما کر نظریں جھکا لیں۔ "میں نے زویا کو بتایا کہ آپ اکیلے نکلے ہیں، میں گھر بیٹھ کر آپ کی لاش کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔"
آریان نے گہرا سانس لیا اور اس فائل کو اپنی جیکٹ کے اندر چھپا لیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کاغذ پر لکھا ایک ایک لفظ حویلی میں زلزلہ لا سکتا تھا۔
جب وہ لوگ واپس حویلی پہنچے، تو چوہدری حشمت اور افتخار احمد برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر دونوں کے چہروں پر اطمینان تو آیا، مگر آریان کے سنجیدہ چہرے نے انہیں پریشان کر دیا۔
"آریان! تم رات کے اس پہر کہاں گئے تھے؟ اور عنایہ... تم اس کے ساتھ؟" چوہدری صاحب نے

گرج دار آواز میں پوچھا۔
آریان نے اپنی جیب سے وہ فائل نکالی اور اپنے والد (افتخار احمد) کے سامنے کر دی۔
"بابا! یہ کیا ہے؟"
افتخار صاحب کا رنگ فق پڑ گیا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے فائل لی اور جیسے ہی پہلی سطر پڑھی، وہ وہیں کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔
"افتخار! کیا ہوا؟" چوہدری حشمت نے آگے بڑھ کر فائل چھین لی۔ جیسے جیسے وہ پڑھتے گئے، ان کی آنکھیں پھیلتی گئیں۔ "یہ... یہ تو میرے بڑے بھائی کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور اس کے بیٹے کا پیدائشی ریکارڈ ہے۔ لیکن اس پر آریان کا نام کیوں ہے؟"
پورے دالان میں موت جیسی خاموشی چھا گئی۔ دادی جان جو کمرے کے دروازے پر کھڑی سب سن رہی تھیں، آگے بڑھیں۔
"کیونکہ یہی سچ ہے حشمت،" دادی جان کی آواز کانپ رہی تھی۔ "آریان تمہارے بڑے بھائی

'چوہدری صولت' کا بیٹا ہے۔ جب صولت کا انتقال ہوا، تو جائیداد کے دشمنوں نے اس کے ننھے سے بیٹے کو مارنے کی کوشش کی۔ افتخار نے اپنی وفاداری نبھائی اور اسے اپنا بیٹا بنا کر شہر لے گیا تاکہ وہ محفوظ رہ سکے۔"

عنایہ کے ہاتھ سے اس کا دوپٹہ چھوٹ گیا۔ وہ جس شخص کو اپنا محافظ سمجھ رہی تھی، وہ تو دراصل اس حویلی کا حقیقی وارث اور اس کا اپنا کزن نکلا۔

چوہدری حشمت کو لگا جیسے ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ انہیں اپنی برسوں کی محنت اور جاگیر خطرے میں نظر آنے لگی۔ "تو اس کا مطلب ہے... میں نے جس بچے کو پالا، جسے اپنا سب کچھ سمجھا، وہ دراصل اس حویلی کا مالک بن کر واپس آیا ہے؟" ان کے لہجے میں اب وہ محبت نہیں تھی، بلکہ ایک سرد مہری آ گئی تھی۔

آریان نے آگے بڑھ کر چوہدری صاحب کے پاؤں چھوئے۔ "انکل! مجھے جائیداد نہیں چاہیے۔ میں وہی آریان ہوں جو کل تھا۔ مجھے اس کاغذ سے کوئی غرض نہیں، میں تو صرف سچ جاننا چاہتا تھا۔"

لیکن شک کا بیج بویا جا چکا تھا۔ شاہ ویز نے جیل میں بیٹھے اپنا مقصد پورا کر لیا تھا۔ اس نے صرف آریان کو سچ نہیں بتایا تھا، بلکہ دو بھائیوں جیسے دوستوں کے درمیان دیوار کھڑی کر دی تھی۔

اسی رات شاہ ویز کے وکیل نے عدالت میں ایک پٹیشن دائر کر دی کہ حویلی کا اصل وارث آریان ہے، لہٰذا چوہدری حشمت کا حویلی پر کوئی قانونی حق نہیں ہے۔

اگلی صبح حویلی کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ چوہدری حشمت نے آریان سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ افتخار احمد شرمندگی کے مارے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکل رہے تھے۔

عنایہ باغ میں کھڑی رو رہی تھی جب آریان اس کے پاس آیا۔

"عنایہ... مجھے لگتا ہے میرا یہاں آنا ایک غلطی تھی۔ میں نے سب کی خوشیاں چھین لی ہیں،" آریان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں آریان! آپ نے ہمیں سچ دیا ہے۔ بابا ابھی غصے میں ہیں، وہ سمجھ جائیں گے،" عنایہ نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی، مگر اسے خود بھی یقین نہیں تھا۔

اچانک حویلی کے باہر پولیس کی ایک اور نفری پہنچی۔ اس بار وہ شاہ ویز کو نہیں، بلکہ آریان کو لینے آئے تھے۔ شاہ ویز نے الزام لگایا تھا کہ آریان نے اسے اغوا کر کے زبردستی ان کاغذات پر دستخط کروانے کی کوشش کی تھی

آریان نے عنایہ کی طرف دیکھا۔ "شاید یہ شہزادی اور اس کے محافظ کی کہانی کا اختتام ہے، عنایہ۔"

پولیس آریان کو ہتھکڑی لگا کر لے جانے لگی۔
عنایہ چیختی رہ گئی، مگر چوہدری حشمت نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ ان کی آنکھوں میں اب اپنی بیٹی کے لیے محبت سے زیادہ اپنی جائیداد بچانے کی فکر تھی۔
آریان جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا، جہاں شاہ ویز پہلے سے موجود تھا۔ شاہ ویز نے آریان کو دیکھ کر ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا۔
"خوش آمدید وارث صاحب! دیکھا؟ میں نے کہا تھا نا کہ میں تمہیں برباد کر دوں گا۔ اب نہ تمہارے پاس حویلی ہے، نہ باپ کا سایہ، اور نہ ہی تمہاری شہزادی۔"
آریان نے خاموشی سے شاہ ویز کو دیکھا اور پھر آسمان کی طرف نظر اٹھائی۔ "شاہ ویز! تم نے صرف کھیل شروع کیا ہے، انجام میں لکھوں گا
جیل کی سلاخوں کے پیچھے کا منظر کسی بھیانک خواب سے کم نہیں تھا۔ حبس اور

اندھیرے میں ڈوبے اس تنگ و تاریک کمرے میں آریان فرش پر بیٹھا تھا اس کے سامنے والے لاک اپ میں شاہ ویز ایک بادشاہ کی طرح کرسی پر براجمان تھا، جسے پولیس والوں نے رشوت کے عوض تمام سہولیات فراہم کر رکھی تھیں۔

"کیوں وارث صاحب؟ کیسا لگ رہا ہے اپنی ہی جاگیر کی جیل میں؟" شاہ ویز نے سگریٹ کا دھواں ہوا میں اچھالتے ہوئے طنزیہ پوچھا۔

آریان نے اپنی زخمی آنکھوں سے اسے دیکھا، مگر خاموش رہا۔ اس کی خاموشی شاہ ویز کو مزید آگ بگولہ کر رہی تھی۔

"تمہیں لگ رہا ہے کہ تمہارا وہ وفادار دوست دانیال تمہیں بچا لے گا؟ یا وہ معصوم شہزادی؟" شاہ ویز زور سے ہنسا۔ "چوہدری حشمت نے اپنی بیٹی کو کمرے میں بند کر دیا ہے اور تمہارے باپ افتخار کو حویلی سے نکال دیا ہے۔ اب تم تنہا ہو آریان، بالکل تنہا!"

آریان کے مکے بھینچ گئے، مگر اس نے خود پر قابو پایا۔ اسے معلوم تھا کہ شاہ ویز اسے مشتعل کر کے کوئی ایسی غلطی کروانا چاہتا ہے جس سے اس کا کیس مزید بگڑ جائے۔

حویلی کے بالائی کمرے میں عنایہ دیوانہ وار دروازہ پیٹ رہی تھی۔ "بابا! دروازہ کھولیں! آریان بے گناہ ہے، آپ جانتے ہیں کہ شاہ ویز جھوٹ بول رہا ہے!"

باہر راہداری میں چوہدری حشمت پتھر بنے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں وہ فائل تھی جس نے ان کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ بیگم زبیدہ روتے ہوئے ان کے پاس آئیں، "حشمت صاحب! خدا کا خوف کریں، وہ بچہ جس نے اپنی جان پر کھیل کر ہماری بیٹی کو بچایا، آپ اسے جیل میں سڑنے کے لیے چھوڑ رہے ہیں؟ صرف اس لیے کہ وہ آپ کے بھائی کا بیٹا ہے؟"

"زبیدہ! یہ جائیداد کا معاملہ ہے،" چوہدری صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔ "اگر آریان باہر

آگیا تو وہ قانوناً اس حویلی کا مالک بن جائے گا۔ میں نے تیس سال اس مٹی کو اپنا خون دیا ہے، میں اسے ایک جھٹکے میں کسی کے حوالے نہیں کر سکتا۔"

عنایہ نے اندر سے یہ سب سن لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے اور ان کی جگہ ایک پختہ عزم نے لے لی۔ اس نے دیکھا کہ کھڑکی کے پاس نیم کے درخت کی شاخیں بالکونی تک آ رہی تھیں۔ اس نے اپنا دوپٹہ مضبوطی سے کمر سے باندھا اور ایک بڑا فیصلہ کر لیا۔

حویلی کے عقبی راستے پر دانیال اپنی گاڑی لیے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ زویا بھی تھی جو بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔

"وہ نہیں آئے گی دانیال، چوہدری صاحب نے پہرہ سخت کر دیا ہے،" زویا نے مایوسی سے کہا۔

"وہ آئے گی، وہ آریان کی شہزادی ہے،" دانیال

نے یقین سے کہا۔
عین اسی وقت دیوار کے سائے سے ایک سایہ نمودار ہوا۔ عنایہ ہانپتی ہوئی ان کے قریب پہنچی۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے اور ہاتھوں پر خراشیں تھیں، مگر اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔
"دانیال! ہمیں ابھی تھانے جانا ہوگا،" عنایہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہی کہا۔
"لیکن عنایہ، پولیس چوہدری صاحب کے زیرِ اثر ہے، وہ ہمیں آریان سے ملنے نہیں دیں گے،" دانیال نے متنبہ کیا۔
"ہم ملنے نہیں جا رہے، ہم وہ ثبوت لینے جا رہے ہیں جو شاہ ویز کے وکیل کے پاس ہے،" عنایہ نے وہ لاکٹ دکھایا جو دادی جان نے اسے دیا تھا۔ "اس لاکٹ کے اندر ایک چھوٹی سی چابی ہے، دادی نے بتایا تھا کہ یہ اس تجوری کی ہے جو شاہ ویز کے وکیل کے آفس میں چھپی ہوئی ہے۔ وہاں شاہ ویز کے تمام کالے دھندوں

کا ریکارڈ ہے۔"
پھر تینوں وکیل کے آفس پہنچتے ہیں خوش قسمتی سے وکیل وہاں موجود نہیں تھا تو دانیال نے بڑی ہوشیاری سے وہ فائل نکالی اور گاڑی میں واپس آگیا جہاں عنایہ اور زویا پہلے سے اس کا انتظار کر رہے تھے
فائل لے کر وہ لوگ جب تھانے پہنچے تو وہاں کا ماحول تناؤ کا شکار تھا۔ عنایہ نے ہمت کی اور براہِ راست ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہو گئی۔
"میرا نام عنایہ حشمت ہے، اور میں یہاں ایک بیان ریکارڈ کروانے آئی ہوں،" اس نے بلند آواز میں کہا۔
اسی وقت شاہ ویز کے سیل سے شور اٹھا۔ آریان نے جب عنایہ کی آواز سنی تو وہ سلاخوں کے قریب آگیا۔ "عنایہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ واپس جاؤ!"
عنایہ سلاخوں کے پاس آئی اور آریان کا ہاتھ

تھام لیا۔ "آریان! آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے، اب میری باری ہے۔"

شاہ ویز نے یہ منظر دیکھا تو دھاڑا، "اوئے لڑکی! تو اپنے باپ کی عزت نیلام کر رہی ہے اس دو ٹکے کے شہری کے لیے؟"

عنایہ نے مڑ کر شاہ ویز کو دیکھا اور نفرت سے کہا، "تم نے صرف جائیداد دیکھی ہے شاہ ویز، میں نے آریان کا دل دیکھا ہے۔ اور آج یہ دل جیتے گا اور تمہارا غرور خاک میں ملے گا۔"

عنایہ نے وہ فائل ایس ایچ او کی میز پر پٹخی جو دانیال نے وکیل کے دفتر سے حاصل کی تھی۔ اس میں شاہ ویز کے دستخط شدہ وہ اعترافات تھے جو اس نے جائیداد ہڑپنے کے لیے کیے تھے۔

پولیس افسر نے کاغذات دیکھے تو اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ ثبوت اتنے ٹھوس تھے کہ وہ مزید شاہ ویز کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔

"شاہ ویز! تم پر جعل سازی اور اقدامِ قتل کا

مقدمہ درج ہوتا ہے،" افسر نے حکم دیا۔ "اور آریان... تم رہا ہو!"

جیل کا دروازہ کھلا۔ آریان باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ سامنے عنایہ کھڑی تھی۔ وہ تھکی ہوئی تھی، زخمی تھی، مگر اس کے چہرے پر وہ مسکراہٹ تھی جس کا وعدہ آریان نے کیا تھا۔

آریان نے عنایہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ صرف محل کی شہزادی نہیں، بلکہ میدانِ جنگ کی ملکہ بھی ہیں۔"

وہ دونوں تھانے سے باہر نکلے ہی تھے کہ سامنے چوہدری حشمت کی گاڑی آ رکی۔ وہ غصے میں گاڑی سے اترے، مگر ان کے ہاتھ میں اب وہ فائل نہیں تھی، بلکہ ان کی آنکھوں میں شرمندگی تھی۔ ان کے پیچھے افتخار احمد بھی کھڑے تھے۔

"آریان... مجھے معاف کر دو بیٹا،" چوہدری حشمت کی آواز بھرا گئی۔ "میں جائیداد کے

لالچ میں اندھا ہو گیا تھا۔ تم میرے بھائی کی نشانی ہو، اور اس حویلی کے اصل حقدار بھی۔"

آریان نے چوہدری صاحب کو گلے لگا لیا۔ "انکل، مجھے حویلی نہیں چاہیے، مجھے صرف اپنا خاندان چاہیے۔"

لیکن کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ شاہ ویز کو لے جایا جا رہا تھا کہ اس نے پلٹ کر آریان کو دیکھا۔ "تم جیت گئے آریان... لیکن یاد رکھنا، شہزادی کو پانا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ابھی ایک راز باقی ہے جو دادی جان نے بھی تمہیں نہیں بتایا۔"

شاہ ویز کے ان الفاظ نے فضا میں ایک نیا تجسس پیدا کر دیا۔

حویلی کو دلہن کی طرح سجایا جا رہا تھا۔ ہر طرف رنگ برنگی لائٹیں اور گلدستے مہک رہے تھے۔ چوہدری حشمت نے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے آریان اور عنایہ کی منگنی کا

اعلان کر دیا تھا۔ پورے گاؤں میں دیگیں چڑھ رہی تھیں اور ڈھول کی تھاپ پر نوجوان رقص کر رہے تھے۔

عنایہ اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے گہرے سبز رنگ کا ریشمی لباس پہنا تھا، جس پر سونے کے تاروں کا کام اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہا تھا۔ زویا اس کے بال سنوارتے ہوئے مسلسل چہک رہی تھی۔

"دیکھا عنایہ! میں نے کہا تھا نا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہو۔ آج تم سچ مچ کی شہزادی لگ رہی ہو، اور آریان صاحب تو کسی شہزادے سے کم نہیں،" زویا نے شرارت سے کہا۔

عنایہ کے لبوں پر مسکراہٹ تو آئی، مگر اس کا دل کسی وسوسے میں گھرا تھا۔ "زویا، شاہ ویز نے جاتے جاتے وہ جو بات کہی تھی... وہ مجھے چین نہیں لینے دے رہی۔ دادی جان بھی اس دن کے بعد سے خاموش ہو گئی ہیں۔"

"ارے چھوڑو بھی! وہ ہارا ہوا جواری تھا، جاتے جاتے تیر چلا گیا۔ تم بس اپنی خوشی پر دھیان دو،" زویا نے اسے حوصلہ دیا۔
دوسری طرف، آریان سیاہ شیروانی میں ملبوس مہمانوں سے مل رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں وہ شہر والا اکھڑ پن اب مدہم پڑ چکا تھا اور اس کی جگہ ایک وقار نے لے لی تھی۔ دانیال اس کے ساتھ سائے کی طرح موجود تھا۔
"مبارک ہو بھائی! اب تو تم آفیشلی اس حویلی کے وارث اور 'شہزادی' کے ہم سفر بننے جا رہے ہو،" دانیال نے آریان کا کندھا تھپتھپایا۔
مگر اس کی نظریں بار بار دادی جان کے کمرے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ دادی جان پچھلے دو دن سے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھیں، انہوں نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنایا تھا، مگر آریان جانتا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔
وہ خاموشی سے محفل سے اٹھا اور دادی جان

کے کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا اور اگر بتی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دادی جان جائے نماز پر بیٹھی دعا کر رہی تھیں۔

"دادی جان..." آریان نے دھیمی آواز میں پکارا۔

دادی جان نے دعا ختم کی اور مڑ کر اسے دیکھا۔ ان کی آنکھیں نم تھیں۔ "آؤ آریان پتر، آج تو تمہاری خوشی کا دن ہے۔ یہاں کیوں آگئے؟"

"دادی! شاہ ویز نے جیل جاتے وقت کہا تھا کہ ایک راز اب بھی باقی ہے۔ وہ کیا ہے؟ کیا اب بھی کچھ ایسا ہے جو مجھے اور عنایہ کو الگ کر سکتا ہے؟" آریان نے ان کے قریب بیٹھ کر پوچھا۔

دادی جان کا ہاتھ کانپنے لگا۔ انہوں نے آریان کا سر اپنی گود میں رکھا۔ "بیٹا! کچھ سچ ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو توڑ دیتے ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ تم اپنی زندگی سکون سے

گزارو، لیکن شاید تقدیر کو کچھ اور ہی منظور ہے۔"
انہوں نے تکیے کے نیچے سے ایک پرانا، پیلا پڑا ہوا خط نکالا۔ "یہ تمہاری ماں کا آخری خط ہے، جو اس نے مرنے سے پہلے میرے حوالے کیا تھا۔ اسے آج پڑھو، کیونکہ کل شاید بہت دیر ہو جائے۔"
آریان نے لرزتے ہاتھوں سے خط کھولا۔ جیسے جیسے وہ لفظ پڑھ رہا تھا، اس کے چہرے کا رنگ اڑتا گیا۔ خط میں لکھا تھا کہ آریان کے والد صولت اور چوہدری حشمت کے درمیان ایک تیسرا بھائی بھی تھا، جس کا نام 'سرور' تھا۔ سرور کو جائیداد سے بے دخل کر دیا گیا تھا اور اس نے بدلے کی آگ میں آریان کی ماں پر ایک ایسا الزام لگایا تھا جس نے اس خاندان کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔
اور سب سے بڑی حقیقت یہ تھی کہ شاہ ویز دراصل اسی 'سرور' کا بیٹا تھا، جسے چوہدری

حشمت کے بھائی نے گود لے لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شاہ ویز اور آریان سوتیلے بھائی نہیں بلکہ جانی دشمن بھائی تھے، اور شاہ ویز کے پاس وہ ثبوت تھا کہ آریان کی ماں بے گناہ تھی، مگر چوہدری حشمت نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔

آریان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ جس چوہدری حشمت کو وہ اپنا ہمدرد سمجھ رہا تھا، وہی اس کی ماں کی بربادی کا ذمہ دار تھا

باہر ڈھول کی آوازیں تیز ہو گئی تھیں۔ چوہدری حشمت آریان کو بلانے کے لیے دادی کے کمرے کی طرف آ رہے تھے۔

"آریان بیٹا! چلو، سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں،" چوہدری صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

آریان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں اب وہ احترام نہیں تھا، بلکہ ایک سرد آگ تھی۔ اس نے وہ خط چوہدری حشمت کے سامنے کر دیا۔

"یہ کیا ہے انکل؟ کیا میری ماں واقعی ویسی ہی تھی جیسا آپ نے دنیا کو بتایا؟"
چوہدری حشمت کے چہرے سے رونق پل بھر میں غائب ہو گئی۔ ان کا سانس پھولنے لگا۔
"آریان... وہ... وہ ایک غلط فہمی تھی... حالات ایسے بن گئے تھے..."
"غلط فہمی؟ آپ کی ایک غلط فہمی نے میری ماں کی زندگی چھین لی، میرے باپ کو دربدر کر دیا اور مجھے ایک یتیم کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا!" آریان کی آواز گرج دار تھی۔
باہر صحن میں کھڑی عنایہ نے یہ آواز سنی تو وہ دوڑتی ہوئی اندر آئی۔ اس کے پیچھے مہمان بھی جمع ہو گئے۔
"آریان! کیا ہوا؟ آپ بابا پر کیوں چلا رہے ہیں؟" عنایہ نے حیرت اور پریشانی سے پوچھا۔
آریان نے عنایہ کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں اس کے لیے محبت تو تھی، مگر اب اس میں نفرت کی ملاوٹ بھی آ گئی تھی۔

"عنایہ! تمہارے بابا نے میری زندگی برباد کی ہے۔ میں اس انسان کی بیٹی سے رشتہ کیسے جوڑ سکتا ہوں جس نے میری ماں کی عزت نیلام کی؟"

عنایہ کو لگا جیسے کسی نے اس کے دل پر خنجر مارا ہو۔ "آریان... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

منگنی کی تقریب ایک ماتم میں بدل گئی۔ مہمان چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ شاہ ویز کا وکیل، جو وہیں موجود تھا، ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا۔

"آریان صاحب! شاہ ویز نے کہا تھا نا کہ وہ آپ کو برباد کر دے گا۔ اس نے یہ خط جان بوجھ کر دادی تک پہنچایا تاکہ آج کا دن آپ کی زندگی کا سیاہ ترین دن بن جائے۔"

آریان نے اپنی شیروانی کا کالر ڈھیلا کیا اور عنایہ کی طرف ایک آخری نظر ڈالی۔ "عنایہ، میں تمہیں شہزادی بنا کر رکھنا چاہتا تھا،

لیکن تمہارے باپ کے گناہ ہمارے درمیان دیوار بن گئے ہیں۔"
وہ حویلی سے باہر کی طرف بھاگا۔ عنایہ نے اسے روکنے کی کوشش کی، "آریان! رک جائیں! میری بات سنیں!" وہ بھاگتے ہوئے گری اور اس کا خوبصورت لباس مٹی میں اٹ گیا۔
آریان اپنی گاڑی میں بیٹھا اور تیزی سے حویلی کے پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ پیچھے حویلی میں چیخ و پکار مچ گئی، کیونکہ چوہدری حشمت کو صدمے کی وجہ سے دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔
رات کے اندھیرے میں آریان کی گاڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، مگر دل میں انتقام کی آگ تھی۔
دوسری طرف، ہسپتال کے آئی سی یو کے باہر عنایہ اکیلی کھڑی تھی، جس کی مہندی کا رنگ ابھی اترا بھی نہیں تھا کہ اس کی دنیا اجڑ گئی۔

اسی وقت اس کے فون پر ایک میسج آیا۔ یہ شاہ ویز کی طرف سے تھا، جو جیل کے ہسپتال میں منتقل ہو چکا تھا:

"کھیل تو اب شروع ہوا ہے شہزادی... ابھی تو تمہیں اپنی محبت اور اپنے باپ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا

ہسپتال کی راہداریوں میں پھیلی وہ مخصوص فینائل کی بو عنایہ کے حواس پر سوار ہو رہی تھی۔ آئی سی یو کے باہر لگی سرخ بتی اس کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ تال میل کھا رہی تھی۔ ڈاکٹرز کی بھاگ دوڑ اور مشینوں کی بیپ بیپ نے اسے یہ احساس دلایا تھا کہ اس کا مضبوط سہارا، اس کا باپ، اب ایک نازک ڈور سے بندھا ہوا ہے۔

زویا نے اسے زبردستی کرسی پر بٹھایا۔ "عنایہ، خود کو سنبھالو۔ تم اس طرح ٹوٹ جاؤ گی تو آنٹی کو کون سنبھالے گا؟"

عنایہ نے خالی نظروں سے سامنے کی دیوار کو

دیکھا۔ "زویا، جس باپ نے میری خاطر پوری دنیا سے دشمنی مول لی، کیا وہ واقعی اتنے بڑے گناہگار ہو سکتے ہیں؟ آریان نے ایک پرانے خط کی بنیاد پر ان کے پیار کو مٹی میں ملا دیا اور مجھے ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ کیا ہماری محبت اتنی کھوکھلی تھی کہ ایک جھوٹے یا سچے خط کی تاب نہ لا سکی؟"

دوسری طرف، شہر کے مضافات میں واقع ایک ویران گیسٹ ہاؤس میں آریان کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح ٹہل رہا تھا۔ اس نے اپنی منگنی کی شیروانی اتار کر پھینک دی تھی اور اب وہ ایک سادہ سیاہ قمیض میں ملبوس تھا، جس کی آستینیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں وہ معصومیت اب مکمل طور پر سرد انتقام میں بدل چکی تھی۔

اس نے دانیال کو فون کیا، جو ابھی ہسپتال سے نکلا ہی تھا۔

"دانیال! مجھے شاہ ویز کے وکیل کا گھر کا پتہ

چاہیے، ابھی اور اسی وقت!" آریان کی آواز میں ایک خوفناک ٹھہراؤ تھا۔
"آریان! ہوش کے ناخن لو، چوہدری صاحب آئی سی یو میں ہیں، زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ کم از کم اس وقت تو..."
"وہ مریں یا جئیں، مجھے اس سے غرض نہیں!" آریان کی دھاڑ نے دانیال کو خاموش کر دیا۔ "مجھے صرف یہ جاننا ہے کہ میری ماں کے ساتھ اس رات کیا ہوا تھا۔ جس 'سرور' کا ذکر اس خط میں ہے، وہ کہاں چھپا ہے؟ شاہ ویز جیل میں ہے مگر اس کا وکیل سب جانتا ہے۔"
آجر دانیال نے آریان کو وکیل کے گھر کا پتا بتا دیا
آریان وکیل کے گھر پہنچا اور اسے دھمکاتے ہوئے وہ معلومات حاصل کر لیں جو اب تک راز تھیں۔ وکیل نے بتایا کہ "سرور" (تیسرا بھائی) جسے سب مردہ سمجھتے تھے، اسے چوہدری

حشمت نے میانوالی کے ایک پرانے گودام "کالے ڈیرے" میں قید کر رکھا ہے۔
آریان جب وہاں پہنچا تو ماحول انتہائی بھیانک تھا۔ وہاں زنجیروں میں بندھا ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا جس کے بال سفید ہو چکے تھے اور آنکھیں وحشت ناک تھیں۔ یہ سرور تھا۔
"تو آ گیا صولت کا بیٹا؟" سرور نے ایک زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "تم سب ایک دوسرے کا خون بہاؤ گے اور آخر میں جیت میری ہی ہوگی!"
آریان نے اس کا گریبان پکڑا۔ "سچ بتاؤ! میری ماں بے گناہ تھی نا؟"
سرور نے قہقہہ لگایا۔ "وہ تو فرشتہ تھی، مگر میں نے حشمت کے کان بھرے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ گھر ٹوٹ جائے، اور وہ ٹوٹ گیا۔ حشمت نے مجھے یہاں قید تو کر دیا، مگر اس کا اپنا ضمیر اسے روز مارتا رہا۔ اسی پچھتاوے

میں اس نے تمہیں شہر سے واپس بلایا تھا تاکہ وہ تمہارا حق تمہیں لوٹا سکے۔"

عین اسی لمحے، عنایہ جو دانیال کے ذریعے آریان کا پیچھا کر رہی تھی، وہاں پہنچ گئی۔ اس نے سرور کے اعترافی جملے سن لیے تھے۔

"آریان! رک جائیں!" عنایہ کی آواز گونجی۔ وہ ہانپ رہی تھی اور اس کا سبز جوڑا مٹی اور بارش کے پانی سے لت پت تھا۔

آریان مڑا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی جو اس نے سرور کی کنپٹی پر رکھی تھی۔

"دیکھو عنایہ! تمہارے باپ نے سچ چھپایا۔ انہوں نے میری ماں کو رسوا ہونے دیا تاکہ وہ جائیداد بچا سکیں،" آریان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"نہیں آریان! انہوں نے اس شیطان (سرور) کو یہاں اس لیے قید کیا تاکہ یہ مزید کسی کی زندگی برباد نہ کرے۔ وہ گناہگار ہیں کہ انہوں نے سچ نہیں بولا، لیکن وہ قاتل نہیں ہیں۔ براہِ

کرم... انتقام کو اپنی محبت پر حاوی مت ہونے دیں،" عنایہ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

آریان نے بندوق نیچے کی، مگر اس کا لہجہ ابھی بھی برف جیسا سرد تھا۔ "عنایہ، جس گھر کی بنیادیں جھوٹ اور میری ماں کی آنسوؤں پر کھڑی ہوں، میں وہاں دوبارہ قدم نہیں رکھ سکتا۔ تمہارے باپ کو شاید میں معاف کر دوں، لیکن یہ رشتہ... یہ اب ممکن نہیں رہا۔"

آریان وہاں سے مڑا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ عنایہ وہیں ویران گودام کے فرش پر بیٹھی رہ گئی، اس کے خواب، اس کی خوشیاں اور اس کی "شہزادی" والی پہچان سب اس کالے ڈیرے کی دھول میں دفن ہو چکی تھی۔

بارش تیز ہو رہی تھی۔ آریان کی گاڑی کی سرخ روشنیاں اندھیرے میں غائب ہو رہی

تھیں اور عنایہ کی سسکیاں فضا میں بکھر رہی تھیں۔
اسی وقت زویا کا ہسپتال سے فون آیا "عنایہ! انکل کو ہوش آگیا ہے، وہ تمہیں پکار رہے ہیں۔"
عنایہ نے فون بند کیا اور آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کا محافظ اب اس کا دشمن بن چکا تھا، اور اس کا باپ اب اس کا واحد سہارا تھا

بارش کی بوندیں اب باقاعدہ طوفان کی شکل اختیار کر چکی تھیں، جیسے آسمان بھی اس بکھرتے ہوئے خاندان کے نوحے پر رو رہا ہو۔
عنایہ اسی کالے ڈیرے کے کچے فرش پر بیٹھی تھی، اس کا قیمتی لباس مٹی میں لت پت تھا اور ہاتھوں کی مہندی بارش کے پانی سے دھل کر پھیکی پڑ چکی تھی۔ اس نے دور جاتی آریان کی گاڑی کی سرخ روشنیوں کو تب تک دیکھا جب تک وہ اندھیرے میں مکمل روپوش نہ ہو گئیں۔

دوسری طرف، سرور زنجیروں میں جکڑا وحشیانہ قہقہے لگا رہا تھا۔ "دیکھ لیا شہزادی؟ تمہارا محافظ تو تمہیں اس ویرانے میں تڑپتا چھوڑ گیا۔ محبت کی بنیادیں ریت پر ہوتی ہیں، ایک ذرا سا سچ اسے بہا لے جاتا ہے!"

عنایہ نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور ایک نئے عزم کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ اس کی معصومیت اب ایک سنگلاخ حقیقت میں بدل رہی تھی۔ اس نے مڑ کر سرور کو دیکھا۔ "تم نے میرے بابا کو گناہگار بنایا، میرے آریان کو مجھ سے چھینا، لیکن تم جیت نہیں سکتے۔ سچ اب سامنے آ چکا ہے، اور اب یہ سچ ہی تمہاری قید بنے گا۔"

عنایہ جب ہسپتال پہنچی، تو اس کی حالت دیکھ کر بیگم زبیدہ کی چیخ نکل گئی۔ زویا بھی وہیں موجود تھی

"عنایہ! تم کہاں چلی گئی تھیں؟ دیکھو

تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے،" زویا نے اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔
"میں اپنی بربادی کا سچ دیکھنے گئی تھی زویا،" عنایہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور سیدھی آئی سی یو کی طرف بڑھی۔
اندر چوہدری حشمت ہوش میں آ چکے تھے، مگر ان کا چہرہ زرد تھا اور آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔ جیسے ہی عنایہ اندر داخل ہوئی، ان کی نظریں اپنی بیٹی پر پڑیں اور شرمندگی سے جھک گئیں۔
"عنایہ... مجھے معاف کر دینا بیٹا،" چوہدری صاحب کی آواز سے گھٹن صاف جھلک رہی تھی۔ "میں نے صولت کے بیٹے کو اس لیے بلایا تھا کہ اپنا پچھتاوا کم کر سکوں، لیکن شاہ ویز نے میرا وہ زخم پھر ہرا کر دیا جسے میں نے بیس سال سے سی رکھا تھا۔"
عنایہ نے ان کا ہاتھ تھاما۔ "بابا، آپ نے سرور کو وہاں کیوں رکھا؟ آپ اسے پولیس کے حوالے

کر سکتے تھے۔"
"پولیس؟" چوہدری صاحب نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اگر میں اسے پولیس کے حوالے کرتا تو خاندان کی رسوائی ہوتی۔ تمہاری ماں کی عزت اور حویلی کا وقار داؤ پر تھا۔ میں نے اسے قید کر کے خود کو بھی ایک عمر قید میں ڈال لیا تھا۔"
آریان اس وقت اپنے پرانے شہر والے اپارٹمنٹ میں تھا، جسے وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا تھا۔ اس نے اپنی منگنی کی انگوٹھی میز پر رکھی اور لیپ ٹاپ کھولا۔ اس نے شاہ ویز کے وکیل کے ذریعے جو ثبوت حاصل کیے تھے، وہ اب ایک ایسی ای میل کی شکل اختیار کر چکے تھے جو پولیس ہیڈ کوارٹر جا رہی تھی۔
وہ شاہ ویز کو جیل میں سڑتے دیکھنا چاہتا تھا، مگر اس کا دل اب بھی عنایہ کے پاس دھڑک رہا تھا۔ اسے بار بار عنایہ کا وہ روتا ہوا چہرہ یاد آ رہا تھا جب اس نے بندوق سرور

کی کنپٹی پر رکھی تھی۔
"میں اس سے نفرت کیوں نہیں کر پا رہا؟" آریان نے دیوار پر زور سے مکا مارا۔ "اس کے باپ نے میری ماں کو گھر سے نکالا، اور میں اب بھی اس کی فکر کر رہا ہوں؟"
اسی وقت اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دانیال کھڑا تھا۔
"آریان، چوہدری صاحب نے سب کچھ اعتراف کر لیا ہے۔ انہوں نے خود پولیس کو فون کر کے سرور کا پتہ بتا دیا ہے۔ . وہ اپنی جائیداد اور اپنی عزت، سب تمہارے نام کر کے خود کو قانون کے حوالے کرنا چاہتے ہیں،" دانیال نے سانس پھولتے ہوئے بتایا۔
اور عنایہ... وہ ٹوٹ چکی ہے۔ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لیے چلی جائے گی تاکہ تمہیں اپنے باپ کا چہرہ دیکھ کر دکھ نہ ہو۔ وہ آج رات کی فلائٹ سے ملک چھوڑ کر جا رہی ہے،" دانیال نے آخری بم

پھوڑا۔
آریان کا غصہ ایک پل میں برف کی طرح پگھل گیا۔ اسے احساس ہوا کہ انتقام کی آگ میں وہ اس ہیرے کو کھو رہا ہے جو اس کے اندھیروں میں واحد روشنی تھی۔
"نہیں! وہ نہیں جا سکتی!" آریان نے اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھائیں۔
"بہت دیر ہو چکی ہے آریان، وہ ایئرپورٹ کے لیے نکل چکی ہے،" دانیال نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر آریان اب کسی کی نہیں سننے والا تھا۔
رات کے اس پہر، سڑکیں خالی تھیں اور آریان کی گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کا ذہن فلم کی طرح پیچھے جا رہا تھا—عنایہ کا وہ معصومانہ ہنسنا، اس کا "میری شہزادی" کہنا، اور وہ پہلی ملاقات جب ان کی نظریں ٹکرائی تھیں۔
ایئرپورٹ کے لاؤنج میں عنایہ خاموشی سے

بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کالی چادر اوڑھ رکھی تھی جس میں اس کا مرجھایا ہوا چہرہ اور بھی اداس لگ رہا تھا۔ اس کے پاس صرف ایک چھوٹا سا بیگ تھا، جس میں اس نے وہی پرانی کتاب رکھی تھی جو وہ حویلی کے باغ میں پڑھتی تھی۔

"فلائٹ نمبر **302** کے مسافر گیٹ نمبر **5** کی طرف تشریف لے جائیں،" اناؤنسمنٹ ہوئی۔

عنایہ اٹھی، اس نے ایک آخری بار پیچھے مڑ کر دیکھا، جیسے اسے امید ہو کہ کوئی اسے پکارے گا۔ مگر وہاں صرف اجنبی چہرے تھے۔

عین اسی وقت ایئرپورٹ کے باہر ایک گاڑی چیختی ہوئی رکی۔ آریان دیوانہ وار سیکیورٹی چیک کی طرف بھاگا۔

"عنایہ! عنایہ!" وہ چلا رہا تھا، مگر ہجوم کے شور میں اس کی آواز دب رہی تھی۔

وہ گیٹ کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ عنایہ بورڈنگ پاس دکھا کر اندر جا رہی تھی۔

"عنایہ رک جاؤ!" اس کی آواز اس بار اتنی بلند تھی کہ عنایہ کے قدم رک گئے۔
اس نے مڑ کر دیکھا۔ آریان ہانپ رہا تھا، اس کے چہرے پر پسینہ اور آنکھوں میں پچھتاوا تھا۔
"تم... تم یہاں کیوں آئے ہو؟" عنایہ کی آواز لرز رہی تھی۔
"میں اپنی شہزادی کو لینے آیا ہوں،" آریان نے اس کے قریب آ کر کہا۔ "مجھے جائیداد نہیں چاہیے، مجھے بدلہ نہیں چاہیے۔ مجھے صرف تم چاہیے ہو۔ تمہارے بابا نے جو کیا، اس کا حساب وہ قانون کو دے دیں گے، لیکن میں تمہیں اپنے گناہوں کی سزا نہیں دے سکتا۔"
عنایہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "آریان، بہت دیر ہو گئی ہے۔ ہمارے درمیان بہت سی لاشیں اور راز ہیں۔"
"کچھ دیر نہیں ہوئی،" آریان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ہم ایک نئی کہانی شروع کریں گے،

جہاں کوئی حویلی نہیں ہوگی، کوئی راز نہیں ہوگا۔ صرف میں اور میری شہزادی۔"

اسی لمحے پولیس کی ایک گاڑی وہاں رکی۔ شاہ ویز کے وکیل نے پیچھے سے گولی چلائی، جو آریان کے کندھے کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ ایئرپورٹ پر بھگدڑ مچ گئی۔ آریان نے عنایہ کو اپنے حصار میں لے لیا۔

شاہ ویز کا آخری وار ابھی باقی تھا، مگر اس بار محافظ اور شہزادی ایک ساتھ کھڑے تھے

ایئرپورٹ کے لاؤنج میں مچی اس بھگدڑ اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے خوشیوں کے اس ادھورے خواب کو ایک بار پھر لہولہان کر دیا تھا۔ آریان کے کندھے سے خون بہہ رہا تھا، مگر اس نے عنایہ کو اپنے وجود کے حصار میں ایسے چھپا رکھا تھا جیسے کوئی ڈھال اپنے عزیز ترین وجود کی حفاظت کرتی ہے۔

ایئرپورٹ کی سیکیورٹی فورسز نے فوراً جوابی کارروائی کی اور شاہ ویز کے وکیل کو

دبوچ لیا، لیکن آریان زخم کی تاب نہ لاتے ہوئے گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ عنایہ نے چیخ مار کر اسے سنبھالا۔ اس کے کالے لباس پر آریان کا سرخ گرم خون پھیل رہا تھا۔

"آریان! آنکھیں کھولیں! آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے!" عنایہ کی آواز ہال میں گونجی۔

آریان نے لرزتے لبوں سے ایک دھیمی مسکراہٹ بکھری۔ "میں... میں نے اپنا وعدہ پورا کیا شہزادی۔ آپ کی فلائٹ... مس ہو گئی نا؟"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، وہ بے ہوش ہو گیا۔ ایمبولینس اسے لے کر ہسپتال کی طرف روانہ ہوئی، وہی ہسپتال جہاں چوہدری حشمت پہلے سے زیرِ علاج تھے۔

دوسری طرف، چوہدری حشمت کو جب پتہ چلا کہ آریان نے عنایہ کو بچاتے ہوئے گولی کھائی ہے، تو ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ انہوں نے افتخار احمد کو اپنے

پاس بلایا۔
"افتخار! میں نے تمہیں اپنا بھائی سمجھا، مگر میں نے تمہارے بیٹے کی زندگی اجیرن کر دی۔ میں اب اس بوجھ کے ساتھ نہیں مرنا چاہتا،" چوہدری صاحب نے ہانپتے ہوئے کہا۔
انہوں نے اپنے وکیل سے ایک وصیت لی۔ "یہ وصیت میں نے برسوں پہلے لکھی تھی، جب آریان شہر گیا تھا۔ اس حویلی کا، اس جائیداد کا اور میری تمام دولت کا تنہا وارث آریان ہے۔ شاہ ویز یا سرور کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ میں نے سرور کو اس لیے قید کیا تھا کیونکہ وہ آریان کی ماں کو مارنا چاہتا تھا۔ میں بزدل تھا کہ سچ نہیں بول سکا، مگر میں قاتل نہیں ہوں۔"
افتخار احمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
"حشمت! تم نے پچھتاوے کی آگ میں خود کو جلا لیا ہے۔ آریان تمہیں معاف کر دے گا، بس تم ہمت مت ہارو۔"

ادھر جیل میں، شاہ ویز کو جب پتہ چلا کہ اس کا وکیل پکڑا گیا ہے اور اس کی تمام سازشیں ناکام ہو چکی ہیں، تو وہ پاگل پن کی حد تک بپھر گیا۔ اس نے حوالات کی سلاخوں سے اپنا سر ٹکرانا شروع کر دیا تھا۔
"نہیں! وہ وارث نہیں بن سکتا! وہ شہزادی میری ہے!" وہ چلا رہا تھا۔
اسی وقت دانیال وہاں پہنچا۔ اس کی آنکھوں میں شاہ ویز کے لیے حقارت تھی۔ "شاہ ویز! تم جیت کر بھی ہار گئے۔ آریان بچ گیا ہے، اور چوہدری صاحب نے تمام حقائق پولیس کو دے دیے ہیں۔ تمہارے باپ 'سرور' نے بھی اعتراف کر لیا ہے کہ اس نے جائیداد کے لیے سب کو دھوکہ دیا۔ اب تمہاری باقی زندگی ان سلاخوں کے پیچھے ہی گزرے گی۔"
شاہ ویز وہیں فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا غرور، اس کی دولت کی ہوس اور اس کا حسد سب ملبے کا ڈھیر بن چکے تھے۔

کچھ دن بعد، ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں آریان اب خطرے سے باہر تھا۔ اس کے کندھے پر پٹی بندھی تھی، مگر اس کے چہرے پر ایک عجیب سا سکون تھا۔ عنایہ اس کے سرہانے بیٹھی اسے اپنے ہاتھوں سے سوپ پلا رہی تھی۔

"اب بس بھی کریں شہزادی صاحبہ! میں بالکل ٹھیک ہوں،" آریان نے چھیڑا۔

عنایہ نے پیالہ میز پر رکھا اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ "آریان، بابا نے سب کچھ آپ کے نام کر دیا ہے۔ وہ اب حویلی چھوڑ کر گاؤں کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہنا چاہتے ہیں تاکہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکیں۔"

آریان نے عنایہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھے وہ حویلی نہیں چاہیے عنایہ، اگر اس میں آپ نہ ہوں۔ میں نے بابا سے بات کی ہے۔ وہ حویلی اب ایک ٹرسٹ بنے گی، جہاں گاؤں کی یتیم بچیوں کی پرورش ہوگی۔ ہم شہر جائیں گے،

جہاں میری محنت اور آپ کی محبت ہوگی۔"
عنایہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک اٹھے۔ "تو کیا اب ہمارا کوئی دشمن نہیں رہا؟"
"دشمن باہر نہیں ہوتے عنایہ، ہمارے اندر کے وسوسے ہوتے ہیں۔ اور ہم نے ان پر جیت پا لی ہے،" آریان نے یقین سے کہا۔
تین ماہ بعد، میانوالی کی وہی سرخ مٹی ایک بار پھر سجی ہوئی تھی، مگر اس بار کوئی جاگیردارانہ رعب نہیں تھا، بلکہ سادگی اور سچی خوشی تھی۔
آریان اور عنایہ کا نکاح ہو رہا تھا۔ زویا اور دانیال کی بھی منگنی ہو چکی تھی اور وہ دونوں اس جوڑے کے گرد خوشی سے گھوم رہے تھے۔ چوہدری حشمت اور افتخار احمد گلے مل رہے تھے، جیسے ماضی کی تمام کدورتیں دھل گئی ہوں۔
جب نکاح خواں نے پوچھا، "آریان صولت، کیا آپ کو عنایہ حشمت نکاح میں قبول ہیں؟"

آریان نے عنایہ کی طرف دیکھا، جس نے آج پھر وہی سبز جوڑا پہنا تھا، مگر اس بار وہ مٹی سے اٹا ہوا نہیں تھا، بلکہ محبت کی چمک سے دمک رہا تھا۔
"قبول ہے!" آریان کی آواز میں پوری زندگی کا عزم تھا۔
عنایہ نے دھیمی آواز میں "قبول ہے" کہا تو حویلی کی فضاؤں میں پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ دادی جان نے دور کھڑے ہو کر ان دونوں کو دعا دی اور آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرائیں، جیسے کہہ رہی ہوں کہ امانت حقدار تک پہنچ گئی ہے۔
گاڑی آہستہ آہستہ حویلی کے پھاٹک سے باہر نکل رہی تھی۔ آریان نے گاڑی روکی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دور پہاڑوں کے پیچھے سورج طلوع ہو رہا تھا، جو ایک نئے دن اور ایک نئی زندگی کی نوید دے رہا تھا۔
"کہاں جا رہے ہیں ہم؟" عنایہ نے پوچھا۔

آریان نے اس کا ہاتھ چوما اور مسکرا کر کہا،
"وہاں... جہاں صرف میں ہوں، اور میری
شہزادی ہوں گے
اختتام



ہاسٹل کا کمرہ نمبر 3

ازقلم:کامی

صبح کا وقت تھاسورج ابھی پوری طرح نہیں نکلا تھا اور آسمان پر ہلکی سنہری روشنی پھیل رہی تھی۔ شہر کے بس اڈے پر ہلکی ہلکی چہل پہل شروع ہو چکی تھی کچھ لوگ اپنے سفر کے لیے بسوں کا انتظار کر رہے تھے اور کچھ مسافر اپنے سامان کے ساتھ ادھر

ادھر کھڑے تھے
اسی بس اڈے کے ایک کونے میں ایک لڑکا اپنے بیگ کے ساتھ کھڑا تھا اس کا نام حمزہ تھا
حمزہ کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت تھی اس کی آنکھوں میں مستقبل کے خواب بھی تھے اور اپنے شہر سے دور جانے کا ہلکا سا دکھ بھی
آج وہ اپنے شہر کو چھوڑ کر ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہا تھا
اس کے ہاتھ میں یونیورسٹی کا داخلہ فارم تھا اور کندھے پر ایک بیگ لٹکا ہوا تھا جس میں اس کا ضروری سامان تھا
اس کے ساتھ اس کے والد بھی کھڑے تھے
بیٹا وہاں جا کر پڑھائی پر دھیان دینا
حمزہ نے مسکرا کر کہا
جی ابو
اس کی امی بھی اس کے ساتھ آئی ہوئی تھیں
انہوں نے دعا دیتے ہوئے کہا

اللہ تمہیں کامیاب کرے
حمزہ نے ان کے ہاتھ چومے اور بس کی طرف بڑھ گیا
چند لمحوں بعد بس چل پڑی
کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے حمزہ نے اپنے شہر کو آہستہ آہستہ پیچھے جاتا ہوا دیکھا راستے میں سرسبز کھیت پھیلے ہوئے تھے کہیں کہیں کسان اپنے کام میں مصروف نظر آ رہے تھے
بس ہموار سڑک پر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی
حمزہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچوں میں گم تھا اسے ہمیشہ سے یونیورسٹی کی زندگی کے بارے میں سننے کا شوق تھا اس کے دوست اکثر کہتے تھے کہ ہاسٹل کی زندگی سب سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے
وہ سوچ رہا تھا کہ وہاں اسے کیسے دوست ملیں گے
کچھ دیر بعد بس ایک چھوٹے سے شہر میں

رکی۔ چند مسافر نیچے اتر گئے اور کچھ نئے لوگ بس میں آ گئے
حمزہ نے پانی کی بوتل نکالی اور ایک گھونٹ لیا
پھر وہ دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا
سفر تقریباً چار گھنٹے کا تھا
وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا
آخرکار بس اس بڑے شہر میں داخل ہو گئی جہاں یونیورسٹی موجود تھی
یہ شہر حمزہ کے شہر سے کافی بڑا تھا سڑکوں پر گاڑیوں کی تعداد زیادہ تھی اور ہر طرف لوگوں کی مصروفیت نظر آ رہی تھی
بس آہستہ آہستہ یونیورسٹی کے بس اسٹاپ پر جا کر رکی
حمزہ نے بیگ اٹھایا اور نیچے اتر گیا
سامنے یونیورسٹی کا بڑا سا گیٹ تھا جس پر سنہری حروف میں یونیورسٹی کا نام لکھا ہوا تھا

حمزہ چند لمحوں تک وہیں کھڑا اس منظر کو
دیکھتا رہا
یہ جگہ واقعی بہت خوبصورت تھی
اندر داخل ہوتے ہی دونوں طرف لمبے درخت
تھے جن کے نیچے طلبہ آ جا رہے تھے
کچھ لڑکے اور لڑکیاں بینچوں پر بیٹھے باتیں
کر رہے تھے
کچھ لوگ جلدی جلدی کلاسوں کی طرف جا
رہے تھے
حمزہ نے اپنے موبائل میں ہاسٹل کا نقشہ
دیکھا اور اس طرف چل پڑا
چند منٹ بعد وہ ایک بڑی عمارت کے سامنے
پہنچ گیا
یہ یونیورسٹی کا بوائز ہاسٹل تھا
عمارت تین منزلوں پر مشتمل تھی اور کافی
پرانی لگ رہی تھی مگر اس کی ساخت
مضبوط تھی
کھڑکیوں سے کہیں کہیں روشنی آ رہی تھی

حمزہ نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا
اندر ایک لمبی راہداری تھی جس کے دونوں طرف کمرے تھے
دیواروں پر مختلف پوسٹر لگے ہوئے تھے کہیں کرکٹ میچ کا پوسٹر تھا اور کہیں کسی سوسائٹی کی میٹنگ کا
راہداری کے آخر میں ایک کمرہ تھا جہاں ہاسٹل کا وارڈن بیٹھتا تھا
حمزہ وہاں پہنچا اور دروازے پر دستک دی
آ جائیں
اندر سے آواز آئی
حمزہ اندر داخل ہوا
کمرے میں ایک درمیانی عمر کا آدمی میز کے پیچھے بیٹھا رجسٹر دیکھ رہا تھا
حمزہ نے ادب سے کہا
السلام علیکم سر
وارڈن نے سر اٹھایا
وعلیکم السلام

جی بتائیں
حمزہ نے کہا
سر میرا آج یونیورسٹی میں داخلہ ہوا ہے
مجھے ہاسٹل کا کمرہ چاہیے
وارڈن نے رجسٹر کھولا اور نام دیکھنے لگا
نام؟
حمزہ
وارڈن نے رجسٹر میں نام ڈھونڈا اور سر ہلایا
ہاں تمہارا نام موجود ہے
پھر اس نے میز سے ایک چابی اٹھائی
یہ لو کمرہ نمبر **3**
حمزہ نے چابی لے لی
شکریہ سر
وہ باہر آ گیا
راہداری میں اب پہلے سے زیادہ خاموشی تھی
وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمروں کے نمبر
دیکھنے لگا
کمرہ نمبر **1**

کمرہ نمبر 2
پھر وہ ایک دروازے کے سامنے رک گیا
کمرہ نمبر 3
دروازہ سادہ سا تھا
حمزہ نے چابی نکالی اور دروازہ کھولا
کمرہ سادہ مگر صاف تھا
اندر ایک بستر تھا، ایک میز، ایک کرسی اور ایک الماری
کھڑکی کے پاس پردہ لگا ہوا تھا
حمزہ نے بیگ نیچے رکھا اور کمرے کو غور سے دیکھنے لگا
اسے کمرہ کافی ٹھیک لگا
اس نے کھڑکی کھولی تو باہر ہاسٹل کا پچھلا حصہ نظر آیا
وہاں چند درخت تھے اور ایک چھوٹا سا راستہ تھا جہاں کبھی کبھار طلبہ آ جا رہے تھے
ہلکی ہوا آ رہی تھی
حمزہ نے اپنا سامان ترتیب دینا شروع کر دیا

کپڑے الماری میں رکھے
کتابیں میز پر رکھ دیں
کچھ دیر بعد اس نے بیگ خالی کر دیا
اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی
ٹھک ٹھک
حمزہ نے دروازہ کھولا
باہر دو لڑکے کھڑے تھے
نیا آیا ہے
حمزہ نے مسکرا کر کہا
جی
میں فراز ہوں
دوسرے نے کہا
اور میں کاشف
حمزہ نے دونوں سے ہاتھ ملایا
فراز نے کہا
ہم ساتھ والے کمرے میں رہتے ہیں
سوچا نئے دوست سے مل لیں
حمزہ نے انہیں اندر آنے کو کہا

تینوں کمرے میں بیٹھ گئے
فراز نے پوچھا
کس ڈیپارٹمنٹ میں ہو؟
کمپیوٹر سائنس
کاشف نے کہا
اچھا ہے یہاں کا ڈیپارٹمنٹ کافی مشہور ہے
وہ کافی دیر تک یونیورسٹی کے بارے میں
باتیں کرتے رہے
فراز نے ہاسٹل کے کچھ اصول بھی بتائے
یہاں رات کو گیٹ ایک خاص وقت کے بعد بند
ہو جاتا ہے
اور اگر کبھی دیر ہو جائے تو وارڈن کو بتانا
پڑتا ہے
اسی دوران راہداری سے دو لڑکیاں گزریں
فراز نے آواز دی
آمنہ
وہ رک گئیں
ان میں سے ایک آمنہ تھی اور دوسری مریم

آمنہ نے مسکرا کر کہا
کیا ہوا؟
فراز نے کہا
یہ ہمارا نیا دوست ہے حمزہ
آمنہ نے کہا
السلام علیکم
حمزہ نے جواب دیا
وعلیکم السلام
مریم نے بھی مسکرا کر سلام کیا
کچھ دیر سب عام باتیں کرتے رہے
پھر آمنہ نے کہا
اچھا ہم چلتے ہیں کل صبح کلاس ہے
وہ دونوں چلی گئیں
فراز اور کاشف بھی اپنے کمرے کی طرف
واپس چلے گئے
حمزہ کمرے میں اکیلا رہ گیا
اس نے بستر پر بیٹھ کر موبائل نکالا اور گھر
فون کیا

امی میں پہنچ گیا ہوں
امی کی آواز آئی
بیٹا کمرہ کیسا ہے
حمزہ نے کہا
بہت اچھا ہے
کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا
رات آہستہ آہستہ گہری ہو رہی تھی
ہاسٹل کی راہداری خاموش ہونے لگی تھی
حمزہ نے لائٹ بند کی اور بستر پر لیٹ گیا
کھڑکی سے ہلکی ہوا آ رہی تھی
درختوں کے پتے ہل رہے تھے
وہ آہستہ آہستہ نیند میں چلا گیا
اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آنے والی راتوں میں
یہی کمرہ نمبر 3
اس کی زندگی کا سب سے عجیب اور پراسرار مقام بننے والا تھا

صبح کی نرم روشنی کھڑکی سے کمرے کے
اندر آ رہی تھی ہاسٹل کی عمارت میں آہستہ
آہستہ چھل پہل شروع ہو رہی تھی کہیں کسی
کے دروازہ بند کرنے کی آواز آ رہی تھی کہیں
راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دے رہی
تھی
حمزہ کی آنکھ آہستہ آہستہ کھلی
وہ چند لمحے بستر پر لیٹا چھت کو دیکھتا رہا
پھر اسے یاد آیا کہ وہ اب اپنے شہر میں نہیں
بلکہ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں ہے
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا
کھڑکی کے باہر صبح کا منظر کافی پرسکون
تھا درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے اور
ہلکی ہوا چل رہی تھی
حمزہ نے گھڑی دیکھی
صبح کے آٹھ بج رہے تھے
اوہ پہلی ہی صبح دیر ہو گئی
وہ جلدی سے اٹھا اور تیار ہونے لگا

کچھ دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکلا
راہداری میں کچھ لڑکے آ جا رہے تھے کسی کے
ہاتھ میں کتابیں تھیں اور کوئی جلدی جلدی
کلاس کی طرف جا رہا تھا
حمزہ ابھی راہداری میں ہی تھا کہ سامنے سے
فراز آتا نظر آیا
اوئے نئے بندے جاگ گئے
حمزہ ہنس پڑا
ہاں ابھی ابھی
فراز نے کہا
چلو ناشتہ کرنے چلتے ہیں ہاسٹل کی کینٹین
اچھی ہے
اسی وقت کاشف بھی آ گیا
چلو جلدی ورنہ سب ختم ہو جائے گا
تینوں ہاسٹل کی کینٹین کی طرف چل پڑے
کینٹین زیادہ دور نہیں تھی چند منٹ بعد وہ
وہاں پہنچ گئے
کینٹین میں کافی طلبہ بیٹھے ناشتہ کر رہے

تھے کہیں چائے کی خوشبو آ رہی تھی اور
کہیں پراٹھے بننے کی آواز
تینوں ایک میز پر بیٹھ گئے
فراز نے کہا
یہاں کا آملیٹ اچھا ہوتا ہے
کاشف نے ہنستے ہوئے کہا
اور چائے بھی
تھوڑی دیر بعد ان کے سامنے ناشتہ آ گیا
کھاتے ہوئے وہ یونیورسٹی کے بارے میں باتیں
کرتے رہے
فراز نے حمزہ سے پوچھا
پہلی بار ہاسٹل میں رہ رہے ہو
حمزہ نے کہا
ہاں
کاشف نے کہا
پھر تو مزہ آئے گا ہاسٹل کی زندگی الگ ہی
ہوتی ہے
ناشتہ کرنے کے بعد وہ یونیورسٹی کی طرف

چل پڑے
یونیورسٹی کا ماحول کافی مصروف تھا۔ ہر طرف طلبہ آ جا رہے تھے
حمزہ کی پہلی کلاس دس بجے تھی
فراز اور کاشف نے اسے اس کی کلاس تک پہنچا دیا
پہلی کلاس کافی دلچسپ تھی پروفیسر نے کورس کے بارے میں بتایا اور طلبہ سے تعارف بھی لیا
کلاس ختم ہونے کے بعد حمزہ باہر آیا تو اسے راہداری میں آمنہ اور مریم نظر آئیں
آمنہ نے مسکرا کر کہا
کیسی رہی پہلی کلاس
حمزہ نے کہا
اچھی تھی
مریم نے کہا
پہلا دن ہمیشہ تھوڑا عجیب لگتا ہے
تینوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔

پھر سب اپنی اپنی کلاسوں کی طرف چلے گئے
دن آہستہ آہستہ گزرتا رہا
شام کے وقت حمزہ واپس ہاسٹل آ گیا
کمرے میں داخل ہو کر اس نے بیگ میز پر
رکھا اور بستر پر بیٹھ گیا
پورا دن کافی مصروف گزرا تھا
کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی
ٹھک ٹھک
حمزہ نے دروازہ کھولا
باہر فراز اور کاشف کھڑے تھے۔
چلو باہر چلتے ہیں، تھوڑا گھومتے ہیں
حمزہ بھی ان کے ساتھ چل پڑا
تینوں ہاسٹل کے پچھلے حصے میں چلے گئے
جہاں ایک چھوٹا سا باغ تھا
وہاں چند بینچ لگے ہوئے تھے اور کچھ طلبہ
بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔
کچھ دیر بعد آمنہ اور مریم بھی وہاں آ گئیں
سب ایک بینچ پر بیٹھ گئے

شام کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی
وہ کافی دیر تک عام باتیں کرتے رہے۔ کسی نے اپنے شہر کے بارے میں بتایا کسی نے اسکول کے زمانے کی باتیں سنائیں
ہنسی مذاق کا ماحول تھا
لیکن اسی دوران حمزہ کو اچانک عجیب سا احساس ہوا
اسے لگا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہو
اس نے آہستہ سے اردگرد نظر دوڑائی
مگر وہاں کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی
وہ دوبارہ باتوں میں مصروف ہو گیا
کچھ دیر بعد سب واپس ہاسٹل کی طرف چل پڑے
رات آہستہ آہستہ گھری ہو رہی تھی
حمزہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا
اس نے دروازہ بند کیا اور بستر پر بیٹھ گیا
کمرہ بالکل خاموش تھا
وہ موبائل دیکھنے لگا

چند منٹ بعد اسے دوبارہ وہی عجیب سا احساس ہوا
جیسے کمرے میں مکمل خاموشی کے باوجود کوئی موجود ہو
حمزہ نے سر اٹھا کر کمرے کو دیکھا
کمرے میں سب کچھ ویسا ہی تھا
میز، کرسی، الماری اور کھڑکی
وہ ہلکا سا مسکرا دیا
شاید میں زیادہ سوچ رہا ہوں
وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا
باہر اندھیرا تھا
درختوں کی شاخیں ہوا میں ہل رہی تھیں
اسی لمحے اچانک
کمرے کے دروازے کے باہر کسی کے قدموں کی آواز آئی
ٹک ٹک ٹک
حمزہ رک گیا
قدموں کی آواز دروازے کے پاس آ کر رک گئی

چند لمحے مکمل خاموشی رہی
حمزہ نے دروازے کی طرف دیکھا
مگر دروازے پر کوئی دستک نہیں ہوئی
کچھ دیر بعد قدموں کی آواز دوبارہ سنائی دی
اور پھر آہستہ آہستہ دور چلی گئی
حمزہ نے گہری سانس لی
شاید کوئی گزر رہا ہوگا
وہ دوبارہ بستر پر آ کر لیٹ گیا
کچھ دیر بعد اسے نیند آ گئی
لیکن اس رات
اسے بار بار ایک عجیب سا خواب آتا رہا
خواب میں وہ ہاسٹل کی اسی راہداری میں
کھڑا ہوتا
اور کوئی اسے دور سے دیکھ رہا ہوتا
مگر وہ شخص کبھی صاف نظر نہیں آتا تھا
حمزہ اچانک آنکھ کھول کر جاگ گیا
کمرے میں اندھیرا تھا
کھڑکی سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی

اس نے گھڑی دیکھی
رات کے دو بجے تھے
وہ دوبارہ لیٹنے لگا
لیکن اسی لمحے
اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے کے
دروازے کے باہر
کوئی چند لمحوں کے لیے کھڑا تھا
پھر آہستہ آہستہ وہاں سے چل دیا
حمزہ چند لمحے خاموش لیٹا رہا
پھر اس نے خود کو سمجھایا
یہ صرف وہم ہے
اور وہ دوبارہ سو گیا
لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ
یہ صرف آغاز تھا
کمرہ نمبر **3** میں آنے والے دنوں میں
ایسی چیزیں ہونے والی تھیں
جو کسی کے بھی تصور سے باہر تھیں

رات کافی گزر چکی تھی
ہاسٹل کی عمارت تقریباً خاموش ہو چکی تھی
کہیں کہیں کسی کمرے سے ہلکی آوازیں آ رہی
تھیں مگر زیادہ تر طلبہ سو چکے تھے
حمزہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا
اسے نیند تو آ گئی تھی مگر وہ پوری طرح
گہری نیند میں نہیں تھا
اچانک
اس کی آنکھ کھل گئی
اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے دروازے کے
باہر آہستہ سے قدم رکھا ہو
ٹک
حمزہ نے آنکھیں کھول کر چھت کی طرف
دیکھا
کمرے میں ہلکا سا اندھیرا تھا کھڑکی سے آنے
والی روشنی کی وجہ سے کچھ چیزیں نظر آ
رہی تھیں
وہ چند لمحے خاموش لیٹا رہا

پھر اسے دوبارہ آواز سنائی دی
ٹک ٹک
جیسے کوئی راہداری میں آہستہ آہستہ چل رہا ہو
حمزہ نے کروٹ بدلی اور دروازے کی طرف دیکھا
دروازہ بند تھا
شاید کوئی باتھ روم جا رہا ہوگا
اس نے خود سے کہا
وہ دوبارہ آنکھیں بند کرنے لگا۔
لیکن چند لمحوں بعد
دروازے کے باہر سے ہلکی سی دستک کی آواز آئی
ٹھک
حمزہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا
وہ کچھ لمحے دروازے کو دیکھتا رہا
مگر دوبارہ کوئی آواز نہیں آئی
حمزہ بستر سے اٹھا اور دروازے کے قریب گیا

اس نے دروازہ کھولا
راہداری خالی تھی
ہلکی سی زرد روشنی بلب سے آ رہی تھی اور
دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا
حمزہ نے چند لمحے ادھر ادھر دیکھا
پھر دروازہ بند کر کے واپس بستر پر آ گیا
شاید میں نے غلط سنا ہوگا
وہ دوبارہ لیٹ گیا
کچھ دیر بعد اسے نیند آ گئی
اگلی صبح
حمزہ کی آنکھ کافی دیر بعد کھلی
اس نے گھڑی دیکھی
صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے
اوہ پھر دیر ہو گئی
وہ جلدی سے اٹھا اور تیار ہونے لگا
کچھ دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکلا
راہداری میں اسے فراز مل گیا
فراز نے کہا

اوئے! آج بھی دیر
حمزہ ہنس دیا۔
پہلی رات نیند ٹھیک نہیں آئی
فراز نے پوچھا
کیوں
حمزہ نے کہا
رات کو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا
فراز نے حیرانی سے پوچھا
سچ
ہاں مگر جب دروازہ کھولا تو کوئی نہیں تھا
فراز نے ہنستے ہوئے کہا
یہ ہاسٹل ہے بھائی یہاں ایسی آوازیں آتی رہتی ہیں
اسی وقت کاشف بھی آ گیا
کیا بات ہو رہی ہے
فراز نے کہا
حمزہ کہہ رہا ہے رات کو کسی نے اس کے دروازے پر دستک دی

کاشف نے ہنستے ہوئے کہا
ہوسکتا ہے کوئی مذاق کر رہا ہو
حمزہ نے بھی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی
تینوں ناشتہ کرنے کینٹین کی طرف چل پڑے
دن معمول کے مطابق گزرا
کلاسیں ہوئیں
طلبہ کی چھل پہل رہی
شام کے وقت حمزہ دوبارہ ہاسٹل واپس آ گیا
وہ تھکا ہوا تھا
اس نے بیگ میز پر رکھا اور بستر پر بیٹھ گیا
کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی
اس بار فراز اور کاشف تھے
چلو باہر چلتے ہیں
تینوں ہاسٹل کے پچھلے حصے میں چلے گئے
وہاں کچھ طلبہ بیٹھے ہوئے تھے
کچھ دیر بعد آمنہ اور مریم بھی آ گئیں
سب ایک ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے
ہنسی مذاق چلتا رہا

لیکن اسی دوران حمزہ کو پھر وہی احساس ہوا
جیسے کوئی دور سے اسے دیکھ رہا ہو
اس نے ایک لمحے کے لیے اردگرد دیکھا
مگر وہاں کچھ خاص نظر نہیں آیا
اس نے بات کو نظر انداز کر دیا
رات
سب اپنے اپنے کمروں میں واپس چلے گئے
حمزہ بھی کمرے میں آ گیا
اس نے دروازہ بند کیا اور بستر پر بیٹھ گیا
کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔
وہ موبائل دیکھتا رہا
پھر کچھ دیر بعد اس نے لائٹ بند کر دی اور لیٹ گیا
کچھ دیر بعد اسے نیند آ گئی
مگر آدھی رات کے قریب
وہ اچانک جاگ گیا
اسے لگا جیسے کمرے میں ہلکی سی سرسراہٹ

ہوئی ہو
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا
کمرے میں اندھیرا تھا
کھڑکی سے تھوڑی سی روشنی آ رہی تھی
وہ خاموشی سے کمرے کو دیکھنے لگا
کچھ نظر نہیں آیا
پھر اچانک
الماری کے اندر سے ہلکی سی آواز آئی
کھرررررررر
حمزہ کا دل تیز دھڑکنے لگا
وہ آہستہ آہستہ بستر سے اٹھا
اور الماری کے قریب گیا
چند لمحے وہ وہیں کھڑا رہا
پھر اس نے آہستہ سے الماری کا دروازہ کھولا
الماری کے اندر کچھ نہیں تھا
صرف اس کے کپڑے لٹکے ہوئے تھے
حمزہ نے گہری سانس لی
میں شاید زیادہ سوچ رہا ہوں

وہ واپس بستر پر آ کر لیٹ گیا
مگر اس رات
اسے بار بار ایسا لگتا رہا جیسے کمرے میں
کوئی حرکت ہو رہی ہو
کبھی دیوار پر کوئ نشانات نظر آتے
کبھی کھڑکی کے پاس
کبھی دروازے کے قریب
مگر جب بھی وہ دیکھتا
وہاں کچھ نہیں ہوتا تھا
آخرکار وہ تھک کر سو گیا
لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ
کمرہ نمبر **3** میں عجیب چیزیں ابھی شروع
ہی ہوئی تھیں
اصل خوفناک واقعات
اب شروع ہونے والے تھے
صبح کی روشنی آہستہ آہستہ کمرے کے اندر
پھیل رہی تھی
حمزہ صبح ٹائم سے جاگ گیا اور جاگتے ہی

دیوار کو غور سے دیکھنے لگا جہاں رات کو
اسے وہ عجیب سے نشانات نظر آئے تھے
وہ پانچ ہلکے سے نشان ایسے لگ رہے تھے
جیسے کسی نے انگلیاں دیوار پر رکھ کر زور
سے دبائی ہوں
حمزہ نے ہاتھ بڑھا کر ان نشانات کو چھوا
دیوار بالکل ٹھنڈی تھی
یہ کیسے ہو سکتا ہے
وہ آہستہ سے بولا
وہ کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے
سر ہلایا
شاید نمی کی وجہ سے بن گئے ہوں گے
اس نے خود کو تسلی دی
مگر اس کے دل میں ہلکا سا خوف ضرور بیٹھ
گیا تھا
وہ تیار ہونے لگا کیونکہ اسے کلاس کے لیے
بھی جانا تھا
کچھ دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکل آیا

راہداری میں صبح کی چہل پہل شروع ہو
چکی تھی
طلبہ ادھر ادھر جا رہے تھے کچھ لوگ ہنستے
ہوئے باتیں کر رہے تھے
اسی دوران اسے فراز نظر آ گیا
فراز نے مسکرا کر کہا
اوئے حمزہ کیا حال ہے
حمزہ نے جواب دیا
ٹھیک ہوں
فراز نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا
تم کچھ پریشان لگ رہے ہو
حمزہ چند لمحے خاموش رہا
پھر اس نے آہستہ سے کہا
یار ایک عجیب بات ہوئی ہے
فراز نے پوچھا
کیا
حمزہ نے اسے دیوار والے نشانات کے بارے میں
بتایا

فراز پہلے تو خاموش رہا
پھر ہنستے ہوئے بولا
یار تم زیادہ ہارر فلمیں دیکھتے ہو
حمزہ بھی ہلکا سا مسکرا دیا
شاید
اسی وقت کاشف بھی آ گیا
کیا باتیں ہو رہی ہیں
فراز نے کہا
حمزہ کہہ رہا ہے اس کے کمرے میں رات کو
کچھ عجیب ہوا ہے
کاشف نے ہنستے ہوئے کہا
او بھائی یہ ہاسٹل ہے یہاں ایسی چیزیں ہوتی
رہتی ہیں
حمزہ نے بھی بات کو وہیں ختم کر دیا
تینوں کینٹین کی طرف چل پڑے
ناشتہ کرتے ہوئے وہ عام باتیں کرتے رہے
کچھ دیر بعد وہ کلاسوں کی طرف چلے گئے
دن معمول کے مطابق گزرا

کلاسیں ہوئیں
طلبہ کی آوازیں لیکچر ہال کی مصروفیت
سب کچھ بالکل عام تھا
لیکن حمزہ کے ذہن میں بار بار رات کا واقعہ آ
رہا تھا
اسے بار بار وہ دیوار کے نشان یاد آ رہے تھے
شام کے وقت وہ واپس ہاسٹل آیا
وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا
کمرہ بالکل ویسا ہی تھا
مگر جب اس نے دیوار کی طرف دیکھا
نشانات اب بھی موجود تھے
اس بار وہ پہلے سے زیادہ واضح لگ رہے تھے
حمزہ نے بھنویں سکیڑ لیں
یہ بات کچھ ٹھیک نہیں ہے
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی
ٹھک ٹھک
حمزہ نے دروازہ کھولا
باہر فراز کاشف اور آمنہ کھڑے تھے

آمنہ نے مسکرا کر کہا
ہم سب باغ میں جا رہے ہیں تم بھی آ جاؤ
حمزہ نے کہا
ہاں چلتے ہیں
وہ سب ہاسٹل کے پچھلے حصے میں چلے گئے
وہاں شام کی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی
کچھ طلبہ بینچوں پر بیٹھے ہوئے تھے
سب بیٹھ کر باتیں کرنے لگے
مریم بھی کچھ دیر بعد آ گئی
کافی دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہا
لیکن اسی دوران آمنہ نے اچانک کہا
حمزہ تم کمرہ نمبر 3 میں رہتے ہو نا
حمزہ نے کہا
ہاں
آمنہ کا چہرہ ایک لمحے کے لیے سنجیدہ ہو گیا
وہ کمرہ کچھ عجیب ہے
حمزہ نے حیرت سے پوچھا
کیوں

آمنہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا
مگر اسی وقت فراز نے ہنستے ہوئے کہا
اوہ پلیز اب یہ مت کہنا کہ وہ کمرہ بھوتوں
والا ہے
کاشف بھی ہنس پڑا
مگر آمنہ کی آنکھوں میں ہنسی نہیں تھی
وہ خاموش ہو گئی
حمزہ نے محسوس کیا کہ شاید وہ کچھ کہنا
چاہتی تھی
مگر اس نے مزید نہیں پوچھا
رات ہونے لگی
سب اپنے اپنے کمروں میں واپس آ گئے
حمزہ بھی کمرے میں آ گیا
اس نے دروازہ بند کیا
کمرے میں خاموشی تھی
وہ بستر پر بیٹھ گیا
اس نے دوبارہ دیوار کے نشانات کو دیکھا
اس کے دل میں عجیب سا احساس پیدا ہوا

پھر اس نے لائٹ بند کر دی اور لیٹ گیا
کچھ دیر بعد اسے نیند آ گئی
مگر رات کے درمیان
وہ اچانک جاگ گیا
کمرے میں مکمل خاموشی تھی
مگر پھر
اسے وہی آواز سنائی دی
کھررر
جیسے کوئی چیز دیوار پر آہستہ سے رگڑ کھا
رہی ہو
حمزہ نے آہستہ سے سر اٹھایا
آواز دیوار کی اسی جگہ سے آ رہی تھی جہاں
وہ نشانات تھے
اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا
وہ بستر سے اٹھا
اور آہستہ آہستہ دیوار کے قریب گیا
آواز اچانک بند ہو گئی
حمزہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا

پھر اس نے دیوار کو غور سے دیکھا
اسے لگا جیسے دیوار کے نشانات تھوڑے سے
ہل رہے ہوں
جیسے کسی نے اندر سے انگلیاں ہلائی ہوں
حمزہ کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی
وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا
اسی لمحے
کمرے کی لائٹ اچانک خود بخود جل گئی
حمزہ چونک گیا
اس نے فوراً سوئچ کی طرف دیکھا
سوئچ اپنی جگہ پر تھا
مگر لائٹ جل چکی تھی
کمرہ روشن ہو گیا
اور اسی روشنی میں
حمزہ نے ایک ایسی چیز دیکھی جس نے اس
کا خون جما دیا
دیوار پر وہ پانچ نشان اب بالکل واضح تھے
اور وہ آہستہ آہستہ

نیچے کی طرف سرک رہے تھے
جیسے کسی کے ہاتھ دیوار پر پھسل رہے ہوں
حمزہ خوف سے ساکت رہ گیا
اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی
چند لمحوں بعد وہ نشان اچانک غائب ہو گئے
دیوار پھر بالکل صاف تھی
کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی
حمزہ کی سانسیں تیز چل رہی تھیں
وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا
پھر آہستہ آہستہ بستر پر واپس بیٹھ گیا
اس رات وہ دوبارہ نہیں سو سکا
اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال گھوم رہا
تھا
یہ کمرہ واقعی عام نہیں تھا
اور شاید
یہ صرف اس کی وہم نہیں تھا
کمرہ نمبر 3 میں واقعی کچھ تھا
کچھ ایسا

جو نظر نہیں آتا تھا
مگر موجود ضرور تھا
اور شاید
وہ چیز حمزہ کو دیکھ رہی تھی
ہاسٹل کی عمارت کے باہر خاموشی پھیلنے لگی تھی دن بھر کی چہل پہل اب کم ہو چکی تھی کہیں کہیں سے ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں مگر زیادہ تر طلبہ اپنے کمروں میں جا چکے تھے
حمزہ اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا
میز پر رکھی ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی کمرے کے ایک حصے کو روشن کر رہی تھی
جبکہ باقی کمرہ نیم اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا
اس کے سامنے کتاب کھلی ہوئی تھی مگر اس کی توجہ کتاب پر نہیں تھی
اس کی نظریں بار بار دیوار کی طرف جا رہی تھیں
وہی دیوار

کھڑکی کے پاس والی
جہاں وہ عجیب نشانات ظاہر ہوئے تھے
حمزہ نے ایک گہری سانس لی اور آہستہ آہستہ
اٹھ کر دیوار کے قریب چلا گیا
نشانات اب بھی وہیں موجود تھے
پانچ انگلیوں جیسے نشان
لیکن اب وہ پہلے سے زیادہ واضح لگ رہے تھے
ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے گیلے ہاتھ
دیوار پر رکھے ہوں
حمزہ کا دل ہلکا سا دھڑکا
وہ کچھ لمحے ان نشانات کو دیکھتا رہا
پھر اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھایا اور ان کو
چھو لیا
دیوار غیر معمولی طور پر ٹھنڈی تھی
اتنی ٹھنڈی کہ اس کے جسم میں ایک سرد لہر
دوڑ گئی
حمزہ فوراً پیچھے ہٹ گیا
یہ نارمل نہیں ہے

وہ آہستہ سے بولا
اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی
ٹھک ٹھک
حمزہ چونک گیا
وہ فوراً دروازے کی طرف گیا اور دروازہ کھول دیا
باہر فراز کھڑا تھا اور اس کے پیچھے کاشف بھی تھا
فراز نے مسکرا کر کہا
اوئےتم تو پورا دن کمرے میں بند رہے کیا کر رہے ہو
حمزہ نے ہلکا سا مسکرا کر کہا
کچھ نہیں بس آرام کر رہا تھا
کاشف نے کہا
چلو نیچے باغ میں چلتے ہیں۔ سب بیٹھے ہوئے ہیں
حمزہ نے ایک لمحے کے لیے دیوار کی طرف دیکھا

پھر اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا
چلو
تینوں نیچے ہاسٹل کے پچھلے حصے میں چلے
گئے
وہاں شام کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی
چند بینچوں پر طلبہ بیٹھے ہوئے تھے
آمنہ اور مریم بھی وہاں موجود تھیں
سب ایک بینچ پر بیٹھ گئے
فراز کسی مزاحیہ واقعے کے بارے میں بتانے
لگا اور سب ہنسنے لگے
کاشف بھی باتوں میں شامل ہو گیا
آمنہ اور مریم اپنے کالج کے دنوں کی باتیں کر
رہی تھیں
مگر حمزہ خاموش بیٹھا تھا
اس کی نظریں بار بار ہاسٹل کی عمارت کی
طرف جا رہی تھیں
خاص طور پر اس کھڑکی کی طرف
جو اس کے کمرے کی تھی

اچانک اسے لگا جیسے پردے کے پیچھے کوئی حرکت ہوئی ہو
حمزہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا
اس نے غور سے کھڑکی کی طرف دیکھا
کچھ لمحے تک پردہ ہلتا ہوا محسوس ہوا
پھر اچانک سب کچھ ساکت ہو گیا
کیا ہوا
آمنہ نے پوچھا
حمزہ نے آہستہ سے کہا
کیا کسی نے میرا کمرہ کھولا ہے
فراز نے ہنستے ہوئے کہا
نہیں بھائی چابی تو تمہارے پاس ہے
حمزہ نے دوبارہ کھڑکی کی طرف دیکھا
اب وہاں کوئی حرکت نہیں تھی
اس نے گہری سانس لی
شاید میں زیادہ سوچ رہا ہوں
کچھ دیر بعد سب واپس ہاسٹل کی طرف چلے گئے

جب حمزہ اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے
پہنچا تو اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا
اسے عجیب سا احساس ہو رہا تھا
جیسے کمرے کے اندر کوئی اس کا انتظار کر
رہا ہو
اس نے آہستہ سے چابی نکالی اور دروازہ
کھول دیا
کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا
حمزہ نے لائٹ آن کی
اور اسی لمحے
وہ ساکت رہ گیا
دیوار پر نشانات پہلے سے زیادہ واضح تھے
اور اس بار
وہ صرف پانچ نہیں تھے
اب وہاں دونوں ہاتھوں کے نشان تھے
جیسے کسی نے دیوار کو دونوں ہاتھوں سے
زور سے پکڑا ہو
حمزہ کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی

وہ آہستہ آہستہ دیوار کے قریب گیا
اس نے غور سے دیکھا
نشانات کے نیچے دیوار کے رنگ میں ہلکا سا
فرق تھا
جیسے وہاں کچھ لکھا ہوا ہو اور بعد میں مٹا
دیا گیا ہو
حمزہ نے میز سے کپڑا اٹھایا اور آہستہ آہستہ
دیوار صاف کرنے لگا
گرد صاف ہوتے ہی چند الفاظ ظاہر ہونے لگے
حمزہ کی سانس رک گئی
دیوار پر لکھا تھا:
مجھے یہاں سے نکالو...
حمزہ کے ہاتھ کانپنے لگے
اسی لمحے کمرے کی لائٹ ہلکی سی جھپکی
پھر دوبارہ جل گئی
حمزہ نے فوراً کمرے کو دیکھا
سب کچھ خاموش تھا
مگر فضا میں عجیب سا دباؤ تھا

جیسے کمرہ سانس روکے کھڑا ہو
اچانک
الماری کے اندر سے ہلکی سی آواز آئی
کھرررررررر
حمزہ آہستہ آہستہ الماری کے قریب گیا
اس نے دروازہ کھولا
اندر صرف اس کے کپڑے تھے
وہ واپس مڑا ہی تھا کہ اچانک
کمرے کے دروازے کے باہر قدموں کی آواز آئی
ٹک ٹک ٹک
قدموں کی آواز آہستہ آہستہ دروازے کے پاس
آ کر رک گئی
حمزہ کی سانسیں تیز ہو گئیں
چند لمحے مکمل خاموشی رہی
پھر دروازے کے باہر سے ایک ہلکی سی
سرگوشی سنائی دی
حمزہ
حمزہ کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی

وہ بالکل ساکت کھڑا رہا
پھر دوبارہ سرگوشی آئی
دروازہ مت کھولنا
حمزہ کا دل زور سے دھڑکا
کیونکہ وہ آواز
بالکل اس کی اپنی آواز جیسی تھی
اسی لمحے دروازے پر زور سے دستک ہوئی
ٹھک
باہر سے فراز کی آواز آئی
حمزہ! دروازہ کھولو
حمزہ فوراً دروازے کی طرف بھاگا اور دروازہ
کھول دیا
فراز اور کاشف دونوں باہر کھڑے تھے
یار سب ٹھیک ہے؟ کاشف نے پوچھا
حمزہ نے گھبرا کر پوچھا
تم ابھی یہاں آئے ہو
فراز نے کہا
ہاں ابھی ہی تو آئے ہیں

حمزہ کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی
کیونکہ چند لمحے پہلے جو سرگوشی ہوئی
تھی
وہ فراز کی آواز نہیں تھی
وہ کسی اور کی تھی
کسی ایسی چیز کی
جو اس کمرے میں موجود تھی
حمزہ آہستہ آہستہ واپس کمرے میں آیا
اس نے دیوار کی طرف دیکھا
وہ الفاظ اب بھی وہاں موجود تھے
مجھے یہاں سے نکالو
اور اسی لمحے
دیوار پر بنے ہاتھوں کے نشان آہستہ آہستہ
نیچے سرکنے لگے
جیسے کوئی دیوار کے اندر سے باہر آنے کی
کوشش کر رہا ہو
حمزہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا
اسے اب یقین ہونے لگا تھا کہ

کمرے میں واقعی کچھ تھا
اور شاید
وہ چیز اب باہر آنا چاہتی تھی۔دیوار پر بنے ہاتھوں کے نشان آہستہ آہستہ نیچے سرکنے لگے جیسے کوئی دیوار کے اندر سے باہر آنے کی کوشش کر رہا ہو
حمزہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا
اس کی سانسیں تیز ہو گئیں
وہ چند لمحے ساکت کھڑا ان نشانات کو دیکھتا رہا
نشان آہستہ آہستہ نیچے آ رہے تھے
جیسے کسی کے ہاتھ پھسل رہے ہوں
حمزہ کو اچانک احساس ہوا جیسے کمرے کی فضا پہلے سے زیادہ ٹھنڈی ہو گئی ہو
اس نے اپنے بازوؤں پر ہاتھ پھیرا
جلد پر ہلکی سی سردی محسوس ہو رہی تھی
فراز اور کاشف بھی اب دیوار کی طرف دیکھ رہے تھے

پہلے تو انہیں کچھ سمجھ نہیں آیا
پھر کاشف کی نظر نشانات پر پڑی
یہ کیا ہے
وہ حیرت سے بولا
فراز بھی دیوار کے قریب آیا
یہ نشان پہلے بھی تھے کیا
حمزہ نے آہستہ سے کہا
ہاں مگر اس طرح حرکت نہیں کر رہے تھے
فراز نے نشانات کو غور سے دیکھا
پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر انہیں چھوا
یار یہ تو واقعی عجیب ہیں
اسی لمحے نشانات اچانک رک گئے
دیوار بالکل ساکت ہو گئی
تینوں چند لمحے خاموش کھڑے رہے
کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی
صرف گھڑی کی ہلکی سی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی
کاشف نے آہستہ سے کہا

مجھے لگتا ہے ہمیں وارڈن کو بتانا چاہیے
فراز نے فوراً کہا
یار وہ ہمیں پاگل سمجھے گا
حمزہ اب بھی دیوار کو دیکھ رہا تھا
اس کے دل میں عجیب سا احساس تھا
اسی لمحے
کمرے کی لائٹ ایک بار پھر ہلکی سی جھپکی
پھر دوبارہ جل گئی
تینوں نے فوراً اوپر بلب کی طرف دیکھا
یہ کیا ہو رہا ہے؟ کاشف نے کہا
فراز نے ہلکے سے ہنسنے کی کوشش کی
شاید وائرنگ خراب ہے
مگر اس کی آواز میں اعتماد نہیں تھا
اسی لمحے
کھڑکی کے پردے میں اچانک حرکت ہوئی
پردہ آہستہ آہستہ ہلنے لگا
حالانکہ کھڑکی بند تھی اور باہر سے کوئی ہوا
نہیں آ رہی تھی

حمزہ نے آہستہ سے کہا
یہ دیکھو
تینوں کی نظریں پردے پر جم گئیں
پردہ ہل رہا تھا
ایسے جیسے کسی نے اسے آہستہ سے ہاتھ لگایا
ہو
پھر اچانک
پردہ بالکل ساکت ہو گیا
چند لمحے مکمل خاموشی رہی
پھر اچانک
کمرے کے کونے سے ایک ہلکی سی سرسراہٹ
سنائی دی
سسسسس
تینوں نے فوراً اس طرف دیکھا
وہ کمرے کا وہ حصہ تھا جہاں الماری رکھی
ہوئی تھی
حمزہ آہستہ آہستہ الماری کی طرف بڑھا
فراز اور کاشف بھی اس کے پیچھے آ گئے

حمزہ نے آہستہ سے الماری کا دروازہ کھولا
اندر اس کے کپڑے لٹکے ہوئے تھے
مگر جیسے ہی اس نے کپڑوں کو تھوڑا سا ہٹایا
اس کی نظر الماری کے اندر کی پچھلی دیوار
پر پڑی
وہاں ایک عجیب سی لکیر بنی ہوئی تھی
جیسے دیوار میں دراڑ ہو
حمزہ نے ہاتھ بڑھا کر اس دراڑ کو چھوا
دیوار کا وہ حصہ تھوڑا سا ہل گیا۔
حمزہ چونک گیا
یہ کیا
فراز فوراً آگے آیا
دیکھنے دو
اس نے دیوار کو زور سے دبایا
اور اچانک
الماری کی پچھلی دیوار کا ایک حصہ آہستہ
سے اندر کی طرف سرک گیا
تینوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے

یہ تو خفیہ دروازہ لگ رہا ہے کاشف نے کہا
دیوار کے پیچھے ایک تنگ سا اندھیرا راستہ
نظر آ رہا تھا
اندر مکمل اندھیرا تھا
اور وہاں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی
حمزہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا
فراز نے موبائل نکالا اور اس کی فلیش لائٹ
آن کر دی
روشنی اندر پڑی تو ایک تنگ سا راستہ نظر آیا
دیواریں پرانی اور نم تھیں
جیسے یہ جگہ کئی سالوں سے بند ہو
کاشف نے آہستہ سے کہا
شاید یہی وہ جگہ ہے
حمزہ نے پوچھا
کون سی جگہ
کاشف نے گہری سانس لی
“لجہاں عمران کے بارے میں لوگ کہتے تھے کہ
کچھ ہوا تھا

کمرے میں اچانک خاموشی چھا گئی
تینوں کچھ لمحے اس اندھیرے راستے کو
دیکھتے رہے
اندر سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی
اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اندھیرے
کے اندر کچھ حرکت کر رہا ہو
اسی لمحے
اس اندھیرے راستے کے اندر سے ایک ہلکی
سی آواز سنائی دی
کھررر
تینوں کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی
فراز نے فوراً موبائل کی روشنی اندر ڈالی
مگر روشنی زیادہ دور تک نہیں جا رہی تھی
راستہ گہرا تھا
اور اس کے آخر میں مکمل اندھیرا تھا
حمزہ نے آہستہ سے کہا
کیا ہمیں اندر جانا چاہیے
فراز نے کچھ لمحے سوچا

پھر اس نے کہا
اگر یہاں واقعی کوئی راز ہے تو ہمیں معلوم کرنا چاہیے
کاشف نے ہچکچاتے ہوئے سر ہلایا۔
مگر اگر
وہ بات ادھوری چھوڑ گیا
اسی لمحے
اندھیرے راستے کے اندر سے دوبارہ وہی سرسراہٹ آئی
اس بار پہلے سے زیادہ واضح
جیسے کوئی چیز آہستہ آہستہ اندر حرکت کر رہی ہو
تینوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے
حمزہ نے موبائل کی روشنی کو تھوڑا آگے کیا
اور اسی لمحے
اسے ایسا لگا جیسے اندھیرے میں کسی کا سایہ ہلا ہو
ایک لمحے کے لیے

پھر دوبارہ سب کچھ ساکت ہو گیا
حمزہ نے خشک حلق سے کہا
مجھے لگتا ہے ہم اکیلے نہیں ہیں
کمرے کی فضا اچانک اور زیادہ ٹھنڈی ہو گئی
اور اندھیرے راستے کے اندر سے
آہستہ آہستہ کسی کے قدموں کی آواز آنے لگی
ٹک
ٹک
ٹک
جیسے کوئی
ان کی طرف آ رہا ہو
اندھیرے راستے کے اندر سے قدموں کی آواز
آہستہ آہستہ سنائی دے رہی تھی
ٹک
ٹک
ٹک
جیسے کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہو حمزہ فراز
اور کاشف تینوں ساکت کھڑے تھے ان کی

نظریں اس خفیہ راستے کے اندر جمی ہوئی
تھیں فراز نے موبائل کی فلیش لائٹ تھوڑی
اور آگے کی روشنی چند قدم آگے تک گئی مگر
اس کے بعد مکمل اندھیرا تھا کاشف نے آہستہ
سے کہا کیا تم دونوں نے بھی سنا حمزہ نے سر
ہلایا ہاں قدموں کی آواز اچانک رک گئی
راستے کے اندر پھر مکمل خاموشی چھا گئی
تینوں کچھ لمحے وہیں کھڑے رہے ان کے دل
تیزی سے دھڑک رہے تھے فراز نے ہمت کر کے
کہا مجھے لگتا ہے ہمیں اندر جا کر دیکھنا
چاہیے کاشف فوراً بولا تم پاگل ہو گئے ہو
حمزہ نے بھی ہچکچاتے ہوئے کہا اگر وہاں
واقعی کوئی ہے تو فراز نے گہری سانس لی اگر
کوئی ہے تو ہمیں پتہ چل جائے گا
چند لمحوں کی خاموشی کے بعد تینوں نے
ایک دوسرے کو دیکھا پھر آہستہ آہستہ وہ
خفیہ راستے کے اندر داخل ہونے لگے
راستہ بہت تنگ تھا دیواریں نم تھیں اور

پرانی سی بدبو آ رہی تھی جیسے یہ جگہ کئی سالوں سے بند ہو
فراز سب سے آگے تھا اس کے موبائل کی روشنی دیواروں پر پڑ رہی تھی حمزہ اس کے پیچھے تھا اور کاشف سب سے آخر میں
چند قدم چلنے کے بعد راستہ تھوڑا سا نیچے کی طرف جانے لگا
حمزہ نے محسوس کیا کہ وہاں کی ہوا عجیب حد تک ٹھنڈی تھی
یہ جگہ ہاسٹل کے نیچے جا رہی ہے کاشف نے آہستہ سے کہا
چند قدم اور چلنے کے بعد انہیں دیوار پر کچھ نظر آیا
فراز نے موبائل کی روشنی وہاں ڈالی دیوار پر عجیب عجیب نشانات بنے ہوئے تھے جیسے کسی نے ناخنوں سے دیوار کو کھرچا ہو
حمزہ نے آہستہ سے کہا یہ دیکھو نشانات کے درمیان کچھ الفاظ بھی لکھے ہوئے تھے مدھم

روشنی میں بمشکل پڑھا جا رہا تھا
فراز نے موبائل قریب کیا دیوار پر لکھا تھا
یہاں سے واپس چلے جاؤ
کاشف نے فوراً کہا مجھے لگتا ہے ہمیں واقعی
واپس جانا چاہیے مگر اسی لمحے راستے کے
اندر سے پھر وہی آواز آئی کھررررر...
جیسے کوئی چیز زمین پر گھسٹ رہی ہو
تینوں کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے
حمزہ نے موبائل کی روشنی تھوڑی اور آگے
کی راستہ اب ایک چھوٹے سے کمرے میں جا
کر ختم ہو رہا تھا
وہ آہستہ آہستہ اس کمرے کے قریب پہنچ گئے
جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے فراز نے اچانک
سانس روک لی
یہ کیا وہ چھوٹا سا کمرہ تھا اس کی دیواریں
پرانی اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں زمین پر گرد
اور مٹی جمی ہوئی تھی مگر کمرے کے بیچ
میں ایک چیز رکھی ہوئی تھی ایک پرانا لکڑی

کا میز اور اس میز پر ایک ڈائری رکھی ہوئی
تھی
حمزہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اس نے ڈائری کو
دیکھا ڈائری پر گرد جمی ہوئی تھی ایسا لگ
رہا تھا جیسے اسے کئی سالوں سے کسی نے
نہیں چھوا
حمزہ نے آہستہ سے ڈائری اٹھائی اس نے گرد
صاف کی ڈائری کے پہلے صفحے پر ایک نام
لکھا ہوا تھا
عمران
حمزہ کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی
یہ وہی عمران ہے کاشف نے آہستہ سے کہا
حمزہ نے ڈائری کھولی پہلے چند صفحات پر
عام باتیں لکھی ہوئی تھیں یونیورسٹی کی
زندگی کے بارے میں دوستوں کے بارے میں
پڑھائی کے بارے میں
مگر جیسے جیسے صفحات آگے بڑھتے گئے
تحریر بدلتی گئی الفاظ بے ترتیب ہونے لگے

اور جملے عجیب ہوتے گئے
ایک صفحے پر لکھا تھا
وہ مجھے دیکھتا ہے
اگلے صفحے پر
وہ دیوار کے اندر ہے
پھر ایک صفحے پر لکھا تھا
وہ رات کو باہر آتا ہے
حمزہ کے ہاتھ کانپنے لگے
اس نے اگلا صفحہ کھولا اس پر صرف ایک
جملہ لکھا تھا
اگر کوئی یہ ڈائری پڑھ رہا ہے
تو فوراً یہاں سے چلا جائے
اسی لمحے کمرے کے پیچھے کی دیوار سے
ہلکی سی آواز آئی
ٹک
تینوں فوراً مڑے دیوار بالکل ساکت تھی چند
لمحے مکمل خاموشی رہی
پھر اچانک دیوار پر ایک سایہ نمودار ہوا ایک

لمبا سا سایہ جیسے کوئی شخص دیوار کے
پیچھے کھڑا ہو حمزہ کا دل زور سے دھڑکا
فراز نے فوراً موبائل کی روشنی دیوار پر ڈالی
مگر وہاں کچھ نہیں تھا سایہ غائب ہو چکا تھا
کاشف نے گھبرا کر کہا ہمیں فوراً یہاں سے
نکلنا چاہیے
اسی لمحے کمرے کے دروازے کے پیچھے سے
قدموں کی آواز آئی
ٹک
ٹک
ٹک
جیسے کوئی تنگ راستے میں آہستہ آہستہ ان
کی طرف آ رہا ہو
حمزہ نے موبائل کی روشنی دروازے کی طرف
کی
راستہ خالی تھا مگر قدموں کی آواز واضح ہو
رہی تھی
تینوں کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے فراز

نے آہستہ سے کہا
وہ یہاں آ رہا ہے
اسی لمحے راستے کے اندھیرے میں ایک سایہ
نظر آیا ایک لمبا سا سیاہ سایہ
وہ آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا
حمزہ کی سانس رک گئی اس نے بمشکل
سرگوشی کی یہ انسان نہیں ہے
سایہ چند قدم اور آگے بڑھا اور پھر موبائل
کی روشنی میں اس کا چہرہ نظر آنے لگا
حمزہ کے ہاتھ سے ڈائری تقریباً گر گئی کیونکہ
وہ چہرہ انسان کا نہیں تھا موبائل کی مدھم
روشنی جب اس کے چہرے پر پڑی تو تینوں
کے جسم میں جیسے بجلی سی دوڑ گئی
اس کی آنکھیں غیر معمولی حد تک بڑی تھیں
اور ان میں عجیب سی زرد روشنی چمک رہی
تھی
چہرہ لمبا اور بے حد پیلا تھا
جیسے کسی مردہ انسان کا ہو

ہونٹ بہت پتلے تھے اور ان کے کناروں سے
سیاہ سا نشان نیچے کی طرف پھیلا ہوا تھا
وہ مخلوق چند لمحے بالکل ساکت کھڑی رہی
حمزہ کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں
اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ڈائری ہلکے ہلکے
کانپ رہی تھی
فراز نے بہت آہستہ سرگوشی کی پیچھے ہٹو
مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتے
وہ سایہ ایک قدم اور آگے بڑھا
اس کے قدموں کی آواز اس چھوٹے سے
کمرے میں عجیب گونج پیدا کر رہی تھی
کاشف نے گھبرا کر دیوار کے ساتھ خود کو لگا
لیا
حمزہ نے فوراً موبائل کی روشنی سیدھی اس
مخلوق کے چہرے پر ڈال دی ایک لمحے کے لیے
وہ روشنی میں واضح نظر آئی
اس کا جسم بہت پتلا تھا بازو غیر معمولی
حد تک لمبے تھے

اور سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ اس کے
ہاتھوں کی انگلیاں عام انسانوں سے کہیں
زیادہ لمبی تھیں
اور ان کے ناخن دیواروں کو کھرچنے والے
نشانات جیسے ہی لگ رہے تھے اچانک وہ
مخلوق رکی پھر اس نے اپنا سر آہستہ آہستہ
ایک طرف جھکایا
جیسے وہ تینوں کو غور سے دیکھ رہی ہو
حمزہ کے گلے سے آواز بمشکل نکلی یہ کیا ہے
اسی لمحے وہ مخلوق اچانک تیزی سے حرکت
میں آئی وہ ایک جھٹکے سے اندھیرے میں
پیچھے ہٹ گئی
فراز نے فوراً موبائل کی روشنی اس کے
پیچھے کی طرف کی مگر وہاں کچھ نہیں تھا
راستہ پھر خالی تھا کمرے میں مکمل
خاموشی چھا گئی
صرف تینوں کی تیز سانسیں سنائی دے رہی
تھیں

کاشف نے گھبرا کر کہا یہ ابھی یہاں تھا تم
دونوں نے دیکھا نا
فراز نے سر ہلایا ہاں مگر وہ کہاں گیا حمزہ نے
فوراً ڈائری کے آخری صفحات کھولنے شروع
کیے اس کا دل کہہ رہا تھا کہ شاید عمران نے
اس کے بارے میں کچھ لکھا ہو
چند صفحات خالی تھے پھر ایک صفحے پر
بہت بے ترتیب تحریر تھی جیسے کسی نے
گھبراہٹ میں جلدی جلدی لکھا ہو
اس پر لکھا تھا یہ دیواروں کے اندر رہتا ہے
حمزہ کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی اس نے
اگلا صفحہ پلٹا یہ روشنی سے ڈرتا ہے
مگر رات کو باہر آتا ہے
فراز نے فوراً کہا
مطلب موبائل کی روشنی اسے روک سکتی ہے
کاشف نے فوراً موبائل نکال کر اس کی فلیش
لائٹ بھی آن کر دی اب کمرہ تھوڑا زیادہ
روشن ہو گیا

حمزہ نے اگلا صفحہ کھولا وہ صفحہ آدھا
پھٹا ہوا تھا اس پر صرف چند الفاظ لکھے تھے
اگر وہ تمہیں دیکھ لے تو بھاگ جاؤ
اسی لمحے کمرے کی چھت سے عجیب سی
آواز آئی
تینوں نے فوراً اوپر دیکھا
چھت پر سائے ہلتے ہوئے نظر آئے جیسے کوئی
چیز دیوار کے اوپر سے رینگ رہی ہو
حمزہ کے ہاتھ کانپنے لگے فراز نے فوراً کہا
بھاگو
تینوں فوراً اس تنگ راستے کی طرف دوڑے
راستہ بہت تنگ تھا اس لیے وہ تیزی سے نہیں
بھاگ پا رہے تھے
پیچھے سے پھر وہی خراش جیسی آواز
سنائی دی
جیسے کوئی چیز دیواروں کے اندر سے ان کے
ساتھ ساتھ حرکت کر رہی ہو کاشف تقریباً
چیخ پڑا یہ ہمارے ساتھ ساتھ آ رہا ہے

حمزہ نے پیچھے مڑ کر موبائل کی روشنی
دیوار پر ڈالی
ایک لمحے کے لیے اسے ایسا لگا جیسے دیوار
کے اندر کسی کا سایہ حرکت کر رہا ہو
وہ فوراً آگے کی طرف دوڑا
چند لمحوں بعد وہ الماری کے پاس پہنچ گئے
فراز نے جلدی سے دیوار کو دھکا دیا خفیہ
دروازہ دوبارہ کھل گیا
جاری ہے....
ازقلم:کامی
تینوں فوراً کمرے میں آ گئے
حمزہ نے فوراً الماری کا دروازہ بند کر دیا چند
لمحے وہ تینوں ہانپتے ہوئے وہیں کھڑے رہے
کمرے میں مکمل خاموشی تھی جیسے کچھ
ہوا ہی نہ ہو
کاشف نے گھبرا کر کہا ہمیں یہ جگہ چھوڑ
دینی چاہیے
فراز نے ابھی جواب ہی دینا تھا

کہ الماری کے اندر سے ہلکی سی آواز آئی ٹک...
تینوں کے جسم ایک دم ساکت ہو گئے پھر
الماری کی پچھلی دیوار پر آہستہ آہستہ
خراشوں کی آواز آنے لگی
خررر
خررر
جیسے کوئی چیز اندر سے دیوار کو کھرچ
رہی ہو
حمزہ کی سانس رک گئی
اور پھر الماری کے اندر سے
آہستہ آہستہ ایک لمبی انگلی باہر کی طرف
نکلنے لگی
وہ انگلی غیر معمولی حد تک لمبی اور پتلی
تھی
اس کا رنگ مٹیالا اور مردہ سا تھا جیسے
کسی پرانی لاش کی جلد ہو
حمزہ کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی
فراز نے فوراً سرگوشی کی

"یہ... یہ کیا ہے"
کاشف کا گلا خشک ہو گیا تھا
وہ بمشکل بولا
"الماری مت کھولنا... شاید یہ خود ہی رک جائے..."
مگر اسی لمحے وہ انگلی الماری کے کنارے کو پکڑنے لگی
ناخن لکڑی پر رگڑ کھا رہے تھے
وہ آواز سن کر تینوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے
پھر آہستہ آہستہ دوسری انگلی بھی باہر آئی
اب وہ ہاتھ واضح نظر آنے لگا تھا
وہ انسانی ہاتھ جیسا تھا
مگر اس کی انگلیاں بہت زیادہ لمبی اور ٹیڑھی تھیں
حمزہ پیچھے ہٹ گیا
فراز نے فوراً موبائل کی فلیش لائٹ اس ہاتھ پر ڈالی

جیسے ہی روشنی اس پر پڑی
وہ ہاتھ اچانک ساکت ہو گیا
چند لمحے مکمل خاموشی رہی
پھر وہ ہاتھ تیزی سے واپس اندر چلا گیا
تینوں نے ایک ساتھ گہری سانس لی
کاشف نے کپکپاتی آواز میں کہا
"شاید... یہ روشنی سے ڈرتا ہے"
حمزہ کو فوراً عمران کی ڈائری کی بات یاد آئی
"یہ روشنی سے ڈرتا ہے"
اسی لمحے
الماری کے اندر سے دوبارہ آواز آئی
اس بار پہلے سے زیادہ تیز
خررر
خررر
جیسے کوئی اندر بے چینی سے حرکت کر رہا ہو
فراز نے گھبرا کر کہا
"ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے"
حمزہ نے سر ہلایا

مگر وہ ابھی دروازے کی طرف بڑھ ہی رہے
تھے کہ
کمرے کی لائٹ اچانک بجھ گئی
کمرہ مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا
کاشف تقریباً چیخ پڑا
"اوہ نہیں"
فراز اور حمزہ نے فوراً موبائل کی فلیش
لائٹس آن کر دیں
کمرہ دوبارہ تھوڑا روشن ہو گیا
مگر اسی لمحے
الماری کا دروازہ آہستہ آہستہ خود بخود کھلنے
لگا

چڑرر
تینوں کی سانسیں رک گئیں
دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا
فراز نے ہمت کر کے موبائل کی روشنی اندر
ڈالی
الماری کے اندر اندھیرا تھا

مگر پھر
اندر دو زرد آنکھیں چمکنے لگیں
حمزہ کا دل زور سے دھڑکا
وہی آنکھیں جو انہوں نے خفیہ راستے میں
دیکھی تھیں
وہ مخلوق اب الماری کے اندر تھی
کاشف نے گھبرا کر کہا
"دروازہ بند کرو"
فراز نے فوراً دروازہ دھکا دے کر بند کرنے کی
کوشش کی
مگر اندر سے کسی نے اسے پکڑ لیا
الماری کا دروازہ زور سے ہلنے لگا
دھڑ دھڑ
جیسے اندر کوئی پوری طاقت سے باہر نکلنے
کی کوشش کر رہا ہو
حمزہ نے جلدی سے میز کو گھسیٹ کر الماری
کے سامنے لگا دیا
چند لمحوں کے لیے دروازہ رک گیا

مگر اندر سے خراشوں کی آواز اب بھی آ رہی
تھی
خررر
خررر
کاشف تقریباً رونے والی آواز میں بولا
“یہ باہر آ جائے گا”
اسی لمحے
دروازے پر زور کا دھکا لگا
دھڑ
میز تھوڑا سا ہل گئی
فراز نے فوراً کہا
“چلو یہاں سے”
تینوں فوراً کمرے کے دروازے کی طرف بھاگے
حمزہ نے دروازہ کھولا
ہاسٹل کی راہداری بالکل خاموش تھی
رات بہت گہری ہو چکی تھی
وہ تینوں تیزی سے راہداری میں نکل آئے
جیسے ہی وہ چند قدم آگے بڑھے

حمزہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا
کمرہ نمبر 3 کا دروازہ آہستہ آہستہ خود بخود بند ہو رہا تھا
چڑرر
پھر اچانک
اندر سے ایک خوفناک چیخ سنائی دی
ایک ایسی چیخ جو کسی انسان کی نہیں لگ رہی تھی
کاشف کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی
"یہ... یہ کیا تھا"
فراز نے آہستہ سے کہا
"وہ... شاید پھنس گیا ہے"
حمزہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ
راہداری کے دوسرے سرے سے ہلکی سی آواز آئی
تینوں نے ایک ساتھ اس طرف دیکھا
راہداری کے آخر میں اندھیرا تھا
مگر اس اندھیرے میں ایک لمبا سا سایہ کھڑا

تھا
حمزہ کی سانس رک گئی
وہی سایہ
وہی لمبا جسم
وہی زرد آنکھیں
وہ مخلوق کمرے میں نہیں تھی
وہ پہلے ہی باہر آ چکی تھی
اور اب
وہ آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی
راہداری میں عجیب سی خاموشی تھی
ہاسٹل کی تمام لائٹس مدھم سی جل رہی تھیں اور دیواروں پر لمبے لمبے سائے بن رہے تھے
حمزہ فراز اور کاشف تینوں ساکت کھڑے تھے
ان کی نظریں راہداری کے آخری سرے پر جمی ہوئی تھیں
وہ سایہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا
اس کے قدموں کی آواز راہداری میں گونج

رہی تھی
حمزہ کے گلے سے بمشکل آواز نکلی
"یہ... یہاں کیسے آ گیا"
فراز نے فوراً سرگوشی کی
"آہستہ بول... شاید یہ ہمیں نہ دیکھے"
مگر اگلے ہی لمحے وہ مخلوق رک گئی
اس نے اپنا سر آہستہ آہستہ اوپر اٹھایا
اور پھر
اس کی زرد آنکھیں سیدھی ان کی طرف
دیکھنے لگیں
کاشف کے منہ سے بے اختیار نکل گیا
"یا اللہ"
وہ مخلوق چند لمحے ساکت کھڑی رہی
پھر اچانک اس کا جسم تھوڑا سا ٹیڑھا ہونے
لگا
جیسے وہ انہیں غور سے دیکھ رہی ہو
حمزہ کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ
اسے اپنے کانوں میں اس کی آواز سنائی دے

رہی تھی
پھر اچانک
وہ مخلوق ایک قدم آگے بڑھی
ٹک
اس کی لمبی انگلیاں زمین کے قریب لٹک رہی تھیں
ناخن فرش کو چھوتے تو ہلکی سی خراش کی آواز پیدا ہوتی
خرر
کاشف نے کانپتی آواز میں کہا
"یہ ہماری طرف آ رہا ہے"
فراز نے فوراً فیصلہ کیا
"دوڑو"
تینوں ایک ساتھ راہداری کے دوسرے سرے کی طرف بھاگ پڑے
ان کے قدموں کی آواز خالی ہاسٹل میں گونج رہی تھی
حمزہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا

وہ مخلوق اب پہلے سے زیادہ تیزی سے ان کے پیچھے آ رہی تھی
اس کی حرکت عجیب تھی
وہ مکمل سیدھا نہیں چل رہی تھی بلکہ تھوڑا جھک کر تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی
جیسے کوئی درندہ شکار کا پیچھا کر رہا ہو
حمزہ کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی
"یہ بہت تیز ہے"
وہ لوگ سیڑھیوں کے قریب پہنچ گئے
فراز نے فوراً سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا
"نیچے چلو"
تینوں سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے
سیڑھیاں تاریک تھیں اور صرف ایک بلب مدھم روشنی دے رہا تھا
جیسے ہی وہ نیچے پہنچے حمزہ نے دوبارہ پیچھے دیکھا
وہ مخلوق سیڑھیوں کے اوپر کھڑی تھی
وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہی

پھر اچانک
وہ تیزی سے سیڑھیوں سے نیچے آنے لگی
ٹک
ٹک
ٹک
اس کے قدموں کی آواز پہلے سے زیادہ تیز تھی
کاشف تقریباً چیخ پڑا
"یہ رک ہی نہیں رہا"
وہ تینوں ہاسٹل کے ہال میں پہنچ گئے
ہال کافی بڑا تھا
مگر وہاں مکمل خاموشی تھی
ایسا لگ رہا تھا جیسے پورے ہاسٹل میں کوئی
اور موجود ہی نہ ہو
حمزہ کو اچانک عمران کی ڈائری یاد آئی
اس نے جلدی سے ڈائری کھولی
فراز نے حیرت سے پوچھا
"اب یہ پڑھنے کا وقت ہے"
حمزہ نے تیزی سے صفحات پلٹتے ہوئے کہا

"اس میں شاید اس سے بچنے کا طریقہ ہو"
چند لمحوں بعد اسے ایک صفحہ ملا
اس پر لکھا تھا
"یہ تاریکی میں طاقتور ہوتا ہے"
حمزہ نے فوراً کہا
"روشنی"
فراز نے فوراً ہال کی تمام لائٹس کے سوئچ آن کر دیے
ایک کے بعد ایک بلب جلنے لگے
ہال روشن ہو گیا
اسی لمحے وہ مخلوق سیڑھیوں سے نیچے آئی
مگر جیسے ہی روشنی اس پر پڑی
وہ اچانک رک گئی
اس نے اپنا سر پیچھے کھینچ لیا
جیسے روشنی اسے تکلیف دے رہی ہو
کاشف نے حیرت سے کہا
"یہ واقعی روشنی سے ڈرتا ہے"
وہ مخلوق چند لمحے ساکت کھڑی رہی

پھر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی
حمزہ نے گہری سانس لی
مگر اسی لمحے
ہال کی ایک لائٹ اچانک جھپکی
پھر دوسری بھی
پھر تیسری
فراز گھبرا گیا
"یہ کیا ہو رہا ہے"
لائٹس ایک ایک کر کے بجھنے لگیں
پورا ہال دوبارہ اندھیرے میں ڈوبنے لگا
اور جیسے جیسے اندھیرا بڑھ رہا تھا
وہ مخلوق دوبارہ ان کی طرف بڑھنے لگی
اس کی زرد آنکھیں اندھیرے میں پہلے سے
زیادہ خوفناک لگ رہی تھیں
حمزہ کو اچانک احساس ہوا کہ وہ اکیلی
مخلوق نہیں ہے
کیونکہ ہال کے دوسرے کونے میں بھی
ایک اور سایہ حرکت کر رہا تھا

پھر
تیسرا
کاشف کے ہاتھ سے موبائل تقریباً گر گیا
وہ ہکلا کر بولا
"یہ... یہ تو تین ہیں"
حمزہ کے دل میں خوف کی ایک نئی لہر اٹھ
گئی
اور پھر
اندھیرے میں سے آہستہ آہستہ مزید زرد
آنکھیں چمکنے لگیں
اندھیرے میں آہستہ آہستہ مزید زرد آنکھیں
چمکنے لگیں
حمزہ کی سانس جیسے رک گئی
پہلے ایک جوڑا
پھر دوسرا
پھر تیسرا
چند ہی لمحوں میں ہال کے مختلف کونوں
میں کئی زرد آنکھیں نظر آنے لگیں

کاشف کے ہاتھ کانپنے لگے
وہ بمشکل بولا
یہ یہ تو بہت زیادہ ہیں
فراز نے جلدی سے موبائل کی فلیش لائٹ آن
کر دی
روشنی ہال میں پھیلی تو سائے ایک لمحے کے
لیے پیچھے ہٹ گئے
مگر وہ غائب نہیں ہوئے تھے
وہ اب بھی وہاں تھے
دیواروں کے قریب
ستونوں کے پیچھے
اور سیڑھیوں کے سائے میں
حمزہ کو عمران کی ڈائری کا وہ جملہ یاد آیا
یہ صرف ایک نہیں ہے
اب اسے اس بات کا مطلب سمجھ آ گیا تھا
یہ مخلوق اکیلی نہیں تھی
یہاں ان جیسے کئی اور موجود تھے
اسی لمحے ہال کے کونے سے ایک مخلوق تھوڑا

آگے بڑھی
اس کا جسم لمبا اور جھکا ہوا تھا
اس کی جلد عجیب سی راکھ جیسی تھی
لمبے ناخن فرش پر گھسٹ رہے تھے
خررر
وہ آواز سن کر کاشف کے جسم میں کپکپی
دوڑ گئی
ہم ہم کہاں پھنس گئے ہیں
فراز نے خود کو مضبوط رکھنے کی کوشش کی
ہمیں روشنی کے پاس رہنا ہوگا
حمزہ نے فوراً ہال کی باقی لائٹس کے سوئچ
تلاش کرنے شروع کیے
مگر اچانک
اوپر والا بلب تیزی سے جھپکنے لگا
پھر وہ بھی بجھ گیا
ہال دوبارہ تقریباً اندھیرے میں ڈوب گیا
صرف موبائل کی مدھم روشنی باقی تھی
اور اسی لمحے

وہ مخلوقات آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگیں
ان کے قدم بہت ہلکے تھے
مگر ان کے ناخن فرش پر گھسٹنے کی آواز
صاف سنائی دے رہی تھی
خرررر
خرررر
حمزہ کے ہاتھ کانپ رہے تھے
ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا
فراز نے فوراً ہال کے دروازے کی طرف اشارہ
کیا
وہاں
ہاسٹل کا بڑا دروازہ ہال کے دوسرے سرے پر
تھا
اگر وہ وہاں تک پہنچ جاتے تو شاید باہر نکل
سکتے تھے
تینوں آہستہ آہستہ اس طرف بڑھنے لگے
مگر جیسے ہی وہ چند قدم آگے بڑھے
ایک مخلوق اچانک ان کے سامنے آ گئی

وہ پہلے سے کہیں زیادہ واضح نظر آ رہی تھی
اس کی آنکھیں زرد روشنی سے چمک رہی
تھیں
چہرہ عجیب طرح سے لمبا تھا
اور اس کے دانت غیر معمولی حد تک نوکیلے
تھے
کاشف کے منہ سے دبے دبے الفاظ نکلے
یہ انسان نہیں ہے
وہ مخلوق چند لمحے ساکت کھڑی رہی
پھر اس نے اپنا سر آہستہ آہستہ ٹیڑھا کیا
جیسے وہ ان کی بو سونگھ رہی ہو
حمزہ کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی
اسی لمحے فراز نے اچانک زور سے موبائل کی
روشنی اس کے چہرے پر ڈال دی
وہ مخلوق فوراً پیچھے ہٹ گئی
جیسے روشنی اسے جلا رہی ہو
فراز نے جلدی سے کہا
دوڑو

تینوں پوری طاقت سے دروازے کی طرف بھاگے
ان کے قدموں کی آواز ہال میں گونج رہی تھی
پیچھے سے وہ مخلوقات بھی حرکت میں آ گئیں
اب ان کے قدموں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی
ٹک ٹک ٹک
حمزہ نے دروازے تک پہنچ کر زور سے ہینڈل کھینچا
مگر دروازہ نہیں کھلا
اس کا دل ڈوب گیا
یہ بند ہے
کاشف نے گھبرا کر کہا
اب کیا کریں
اسی لمحے
پیچھے سے ایک تیز خراش کی آواز آئی
خرررر

وہ مخلوقات بہت قریب آ چکی تھیں
ان کی زرد آنکھیں اب چند قدم کے فاصلے پر
تھیں
فراز نے جلدی سے اردگرد دیکھا
پھر اچانک اس کی نظر دیوار پر لگے ایک
چھوٹے سے سوئچ باکس پر پڑی
وہ فوراً اس طرف بھاگا
اس نے ڈھکن کھولا
اندر ہاسٹل کی مین بجلی کے سوئچ تھے
فراز نے فوراً ایک بڑا لیور نیچے کھینچ دیا
اچانک پورے ہال میں تیز روشنی پھیل گئی
تمام لائٹس ایک ساتھ جل اٹھیں
وہ مخلوقات فوراً پیچھے ہٹ گئیں
ان کی آنکھیں روشنی میں سکڑ گئیں
حمزہ نے حیرت سے دیکھا
روشنی میں ان کے جسم پہلے سے زیادہ واضح
نظر آ رہے تھے
وہ واقعی انسان جیسے تھے

مگر مکمل انسان نہیں
ان کی جلد بیمار سی سرمئی تھی
اور ان کے چہرے عجیب طرح سے بگڑے ہوئے تھے
کاشف نے خوف سے سرگوشی کی
یہ پہلے انسان تھے
اسی لمحے
ان مخلوقات میں سے ایک نے ایک ایسی آواز نکالی جو انسان اور جانور کے درمیان کہیں تھی
اور پھر
ہال کی لائٹس دوبارہ جھپکنے لگیں
حمزہ کے دل میں خوف کی ایک نئی لہر اٹھ گئی
کیونکہ اسے اچانک احساس ہوا
اگر روشنی دوبارہ بجھ گئی
تو وہ سب ان کے درمیان پھنس جائیں گے ہر جھپک کے ساتھ روشنی کمزور ہو رہی تھی

حمزہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی
اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر روشنی
بجھ گئی تو وہ مخلوقات فوراً ان پر حملہ کر
دیں گی
فراز نے جلدی سے مین سوئچ کو مضبوطی
سے پکڑ لیا
کوئی اس کو بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے
حمزہ نے چونک کر پوچھا
کون
اسی لمحے سوئچ باکس کے اندر سے عجیب
سی آواز آئی
خررر
جیسے اندر کوئی چیز حرکت کر رہی ہو
فراز نے فوراً ہاتھ پیچھے کھینچ لیا
اچانک سوئچ باکس کے اندر سے ایک لمبی مڑی
ہوئی انگلی باہر نکلی
وہی سرمئی جلد
وہی لمبا نوکیلا ناخن

کاشف چیخ پڑا
یہ یہاں بھی ہے
فراز نے فوراً سوئچ باکس کا دروازہ زور سے بند کر دیا
مگر لائٹس اب بھی جھپک رہی تھیں
ادھر ہال کے کونے میں کھڑی مخلوقات آہستہ آہستہ دوبارہ آگے بڑھنے لگیں
روشنی کمزور ہو رہی تھی اور ان کی ہمت بڑھ رہی تھی
ان کے قدموں کی آواز ہال میں گونج رہی تھی
حمزہ نے بے چینی سے اردگرد دیکھا
ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا
فراز نے فوراً کہا
دروازہ تو بند ہے
اسی لمحے کاشف کی نظر ہال کے ایک اور کونے پر گئی
وہاں ایک تنگ سا دروازہ تھا
شاید اسٹور روم کا

وہاں دیکھو
تینوں فوراً اس دروازے کی طرف بھاگے
حمزہ نے ہینڈل پکڑ کر زور سے کھینچا
دروازہ کھل گیا
اندر مکمل اندھیرا تھا
مگر وہ تینوں فوراً اندر داخل ہو گئے
فراز نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا
کمرے کے اندر پرانی چیزوں کی بو آ رہی تھی
یہ واقعی ایک اسٹور روم تھا
پرانی کرسیاں ٹوٹے ہوئے میز اور کچھ ڈبے
وہاں پڑے تھے
کاشف نے کانپتی آواز میں کہا
وہ ہمارے پیچھے تو نہیں آئے
حمزہ نے دروازے کے نیچے سے باہر دیکھا
ہال کی روشنی مدھم ہو رہی تھی
اور باہر وہ مخلوقات اب بھی ہال میں گھوم
رہی تھیں
مگر انہوں نے ابھی تک اسٹور روم کا دروازہ

نہیں کھولا تھا
فراز نے آہستہ سے کہا
شاید انہیں نہیں معلوم ہم یہاں ہیں
حمزہ نے ڈائری کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا
اس نے دوبارہ اسے کھولا
شاید عمران نے اس بارے میں کچھ لکھا ہو
وہ تیزی سے صفحات پلٹنے لگا
پھر اچانک ایک صفحہ نظر آیا جس پر تحریر
بہت بے ترتیب تھی
جیسے عمران بہت خوف میں لکھ رہا ہو
اس پر لکھا تھا
وہ روشنی سے ڈرتے ہیں مگر اندھیرے میں
سب کچھ سن سکتے ہیں
حمزہ نے فوراً سر اٹھایا
سب لوگ خاموش رہو
تینوں فوراً بالکل ساکت ہو گئے
کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی
چند لمحوں بعد

باہر سے قدموں کی آواز سنائی دی
وہ مخلوقات اسٹور روم کے دروازے کے قریب
آ گئی تھیں
کاشف کے ماتھے پر پسینہ آ گیا
وہ سانس بھی آہستہ لے رہا تھا
اچانک
دروازے کے دوسری طرف سے خراش کی آواز
آئی
جیسے کسی نے اپنے ناخن دروازے پر رگڑے
ہوں
حمزہ کا دل زور سے دھڑکنے لگا
وہ آواز چند لمحے جاری رہی
پھر اچانک رک گئی
قدموں کی آواز دوبارہ دور جانے لگی
فراز نے آہستہ سے سانس لی
شاید وہ چلے گئے
مگر اسی لمحے
کمرے کے اندر سے ہلکی سی آواز آئی

کھٹ

تینوں چونک کر مڑے

آواز اسٹور روم کے پچھلے حصے سے آئی تھی
جہاں ایک پرانی لکڑی کی الماری رکھی ہوئی
تھی

حمزہ نے آہستہ سے موبائل کی روشنی اس
طرف کی

الماری کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا
حالانکہ چند لمحے پہلے وہ بند تھا

کاشف نے کانپتی آواز میں کہا
یہ ابھی تو بند تھی

اسی لمحے الماری کے اندر سے آہستہ آہستہ
حرکت ہوئی

دروازہ مزید کھلنے لگا

چڑرررر

حمزہ کا دل ڈوب گیا

کیونکہ الماری کے اندر اندھیرے میں
دو زرد آنکھیں چمک رہی تھیں

اور پھر
وہی لمبا سرمئی ہاتھ آہستہ آہستہ باہر نکلنے لگا
جیسے وہ مخلوق پہلے سے ہی ان کے انتظار
میں وہاں چھپی ہوئی تھی

رات بہت گہری تھی مگر آسمان پر چاند نکل
آیا تھا
چاندنی میں ہاسٹل کی عمارت دور کھڑی نظر
آ رہی تھی
کاشف زمین پر بیٹھ گیا
اس کی سانس اب بھی تیز تھی
"ہم واقعی باہر آ گئے"
فراز نے بھی آسمان کی طرف دیکھ کر گہری
سانس لی
مگر حمزہ اب بھی خاموش کھڑا تھا
وہ ہاسٹل کی طرف دیکھ رہا تھا
کیونکہ اسی لمحے
ہاسٹل کی ایک کھڑکی کے اندھیرے میں

اسے دوبارہ وہی سرخ آنکھیں چمکتی ہوئی
نظر آئیں
کے چلنے کی آواز سنائی دی
مگر یہ آواز انسان کے قدموں جیسی نہیں تھی
یہ آواز بھاری تھی
اور غیر معمولی
حمزہ فوراً رک گیا
فراز نے سرگوشی کی
یہ کیا ہے
اگلے ہی لمحے
سیڑھیوں کے نیچے والے اندھیرے سے دو سرخ
آنکھیں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی ہوئی نظر آئیں
سیڑھیوں کے نیچے اندھیرے میں وہ دو سرخ
آنکھیں آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہی تھیں
حمزہ فراز اور کاشف وہیں رک گئے
تینوں کی سانسیں تیز ہو چکی تھیں
کمرے کی خاموشی سے نکل کر اب وہ ہاسٹل
کی سنسان راہداری میں کھڑے تھے اور نیچے

سیڑھیوں کے اندھیرے سے کچھ اوپر آ رہا تھا
فراز نے آہستہ سے سرگوشی کی
"وہ... وہی مخلوق ہے..."
کاشف کے ہاتھ کانپنے لگے
حمزہ نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے دونوں کو
پیچھے ہٹنے کا کہا
وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے
مگر سیڑھیوں کے نیچے وہ سرخ آنکھیں اب
مزید واضح ہو رہی تھیں
چند لمحوں بعد ایک لمبا سیاہ سایہ سیڑھیوں
پر ظاہر ہوا
وہ مخلوق آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہی
تھی
اس کے قدموں کی آواز عجیب تھی
ٹک
ٹک
ٹک
مگر یہ آواز انسانی قدموں جیسی نہیں تھی

یہ بھاری اور بے ترتیب تھی
حمزہ نے فوراً فیصلہ کیا
"دوڑو"
تینوں فوراً راہداری کی دوسری طرف بھاگنے لگے
ان کے قدموں کی آواز خالی ہاسٹل میں گونجنے لگی
ٹک ٹک ٹک ٹک
پیچھے سے ایک خوفناک چیخ سنائی دی
وہ مخلوق انہیں دیکھ چکی تھی
اس کی آواز گونجی
خرررررر
اب وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی
فراز نے گھبرا کر کہا
"جلدی"
وہ تینوں سیڑھیوں کے بجائے پچھلے دروازے کی طرف بھاگے جو ہاسٹل کے صحن میں کھلتا تھا

چند لمحوں بعد وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئے
رات اب بھی گہری تھی
چاند بادلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا
ہاسٹل کا صحن تقریباً اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا
دور درختوں کی قطاروں کے پیچھے پرانی لائبریری کی عمارت نظر آ رہی تھی
وہ عمارت بہت پرانی تھی
دیواروں پر کائی جمی ہوئی تھی
کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں
اور دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا
زیادہ تر طلبہ اس جگہ کے قریب بھی نہیں جاتے تھے
کاشف نے ہانپتے ہوئے کہا
"ہم... وہیں جا رہے ہیں"
حمزہ نے کہا
"ہاں... ڈائری میں یہی لکھا تھا"

اسی لمحے پیچھے ہاسٹل کے دروازے سے زور
کی آواز آئی
دھڑام
وہ مخلوق باہر آ چکی تھی
اس کی سرخ آنکھیں اندھیرے میں صاف نظر
آ رہی تھیں
فراز نے فوراً کہا
"دوڑو"
تینوں پوری طاقت سے لائبریری کی طرف
بھاگنے لگے
ان کے قدموں کے نیچے سوکھے پتوں کی آواز
آ رہی تھی
چررر
چررر
پیچھے وہ مخلوق بھی صحن میں اتر چکی
تھی
اس کی چیخ رات کی خاموشی کو چیر رہی
تھی

خرررر
چند لمحوں بعد وہ لائبریری کے دروازے تک پہنچ گئے
دروازہ پرانا اور زنگ آلود تھا
حمزہ نے اسے زور سے دھکا دیا
چڑرررر
دروازہ آہستہ آہستہ کھل گیا
اندر مکمل اندھیرا تھا
فراز نے فوراً دروازہ بند کر دیا
کمرے کے اندر ٹھنڈی اور باسی ہوا پھیلی ہوئی تھی
کاشف نے موبائل کی ٹارچ آن کر دی
روشنی پھیلتے ہی وہ تینوں رک گئے
لائبریری واقعی بہت پرانی تھی
ہر طرف پرانی کتابوں کی الماریاں تھیں
زیادہ تر کتابوں پر موٹی گرد جمی ہوئی تھی
کچھ الماریاں ٹوٹی ہوئی تھیں
چھت کے کونے میں مکڑیوں کے جالے لٹک رہے

تھے
ایسا لگ رہا تھا جیسے یہاں برسوں سے کوئی
نہیں آیا
فراز نے آہستہ سے کہا
"یہ جگہ تو واقعی ڈراؤنی ہے"
حمزہ نے کہا
"تہہ خانہ ڈھونڈو"
تینوں احتیاط سے اندر چلنے لگے
فرش پر گرد کی موٹی تہہ تھی
ان کے قدموں کے نشان واضح بن رہے تھے
ٹک
ٹک
ٹک
کچھ دیر تلاش کرنے کے بعد انہیں لائبریری کے
پچھلے حصے میں ایک پرانا لکڑی کا دروازہ
نظر آیا
دروازہ آدھا ٹوٹا ہوا تھا
اس کے نیچے سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں

حمزہ نے آہستہ سے کہا
"یہی ہوگا"
کاشف نے نیچے ٹارچ کی روشنی ڈالی
سیڑھیاں کافی گہری جا رہی تھیں
اور نیچے مکمل اندھیرا تھا
فراز نے کہا
"چلو"
تینوں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگے
سیڑھیاں بہت پرانی تھیں
ہر قدم کے ساتھ چرچراہٹ کی آواز آ رہی تھی
چڑ
چڑ
چند لمحوں بعد وہ نیچے پہنچ گئے
یہ واقعی ایک تہہ خانہ تھا
کمرہ کافی بڑا تھا
دیواریں پتھر کی بنی ہوئی تھیں
اور کمرے کے درمیان ایک پرانی میز رکھی
ہوئی تھی

مگر جیسے ہی ٹارچ کی روشنی میز پر پڑی
حمزہ رک گیا
میز پر ایک اور ڈائری رکھی ہوئی تھی
وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی عمران کی
ڈائری تھی
حمزہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا
اس نے ڈائری اٹھائی
پہلا صفحہ کھولا
اس پر لکھا تھا
"اگر تم یہاں تک پہنچ گئے ہو
تو اس کا مطلب ہے وہ تمہارے پیچھے ہیں"
فراز نے گھبرا کر کہا
"یہ عمران نے ہی لکھی ہے"
حمزہ نے اگلی لائن پڑھی
اور اس کے چہرے کا رنگ فوراً بدل گیا
کیونکہ اس پر لکھا تھا
"مگر سب سے خوفناک بات ابھی باقی ہے
کیونکہ ان مخلوقات کا اصل دروازہ ابھی تک

بند نہیں ہوا"
اسی لمحے
تہہ خانے کی چھت کے اوپر سے زور کی آواز
آئی
دھڑام
جیسے لائبریری کا دروازہ توڑ دیا گیا ہو
کاشف کی آواز کانپ گئی
"وہ... یہاں آ گیا ہے"
حمزہ فراز اور کاشف تیزی سے نیچے اتر رہے
تھے
وہ سیڑھیاں بہت پرانی تھیں
ہر قدم کے ساتھ عجیب سی چرچراہٹ سنائی
دیتی تھی
چڑ
چڑ
کاشف کے ہاتھ میں موبائل کی ٹارچ جل رہی
تھی اور اس کی روشنی پتھر کی گیلی
دیواروں پر پڑ رہی تھی

دیواروں پر کائی جمی ہوئی تھی
اور کہیں کہیں عجیب سے نشانات بنے ہوئے
تھے
فراز نے آہستہ سے کہا
"یہ جگہ... بہت پرانی لگ رہی ہے"
حمزہ نے نیچے اندھیرے کی طرف دیکھا
سیڑھیاں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی
تھیں
"شاید یہ وہی جگہ ہے جس کے بارے میں
عمران نے لکھا تھا"
اسی لمحے اوپر سے ایک خوفناک چیخ سنائی
دی
خرررررر
وہ مخلوق تہہ خانے میں پہنچ چکی تھی
اور اب وہ بھی نیچے آ رہی تھی
کاشف گھبرا کر بولا
"وہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے"
حمزہ نے کہا

"جلدی نیچے اترو"
تینوں اور تیزی سے نیچے اترنے لگے
چند لمحوں بعد سیڑھیاں ختم ہو گئیں
وہ ایک بڑے زیرزمین کمرے میں پہنچ گئے
یہ جگہ پہلے والی سرنگوں سے بھی زیادہ عجیب تھی
کمرہ گول شکل کا تھا
اس کی دیواریں پرانے پتھروں سے بنی ہوئی تھیں
اور کمرے کے درمیان ایک عجیب سا لوہے کا دروازہ کھڑا تھا
وہ دروازہ بہت بڑا تھا
تقریباً دس فٹ اونچا
اس پر عجیب و غریب نشان بنے ہوئے تھے
کاشف نے حیرت سے کہا
"یہ... کیا ہے"
حمزہ نے آہستہ سے کہا
"یہی ہوگا... اصل دروازہ"

فراز نے اس کے قریب جا کر دیکھا
دروازے کے بیچ میں ایک گول سوراخ تھا
جیسے وہاں کبھی کوئی خاص چابی لگتی ہو
مگر اب وہ خالی تھا
حمزہ نے ڈائری کے آخری الفاظ یاد کیے
"وہ دروازہ کھولنا آسان ہے
بند کرنا نہیں"
فراز نے پریشان ہو کر پوچھا
"اب کیا کریں"
حمزہ دروازے کے اردگرد دیواروں کو غور سے
دیکھنے لگا
کچھ لمحوں بعد اسے ایک عجیب چیز نظر آئی
دروازے کے دائیں طرف دیوار میں ایک پرانا
لوہے کا ہینڈل لگا ہوا تھا
شاید کسی میکانزم کا حصہ
حمزہ نے اسے پکڑ کر ہلانے کی کوشش کی
چڑڑ
وہ ہینڈل تھوڑا سا حرکت کر گیا

اسی لمحے پورا کمرہ ہلکا سا کانپ گیا
کاشف گھبرا کر بولا
"یہ کیا تھا"
حمزہ نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا
شاید یہ دروازے کے نظام کا حصہ تھا
اسی لمحے اوپر والی سیڑھیوں سے قدموں
کی آواز گونجی
ٹک
ٹک
ٹک
وہ مخلوق اب نیچے اتر رہی تھی
فراز نے گھبرا کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا
اندھیرے میں سرخ آنکھیں آہستہ آہستہ نیچے
آ رہی تھیں
کاشف کی آواز کانپ گئی
"وہ... پہنچ گیا"
مخلوق اب آخری سیڑھی پر کھڑی تھی
اس کا لمبا سیاہ جسم روشنی میں واضح نظر

آ رہا تھا
اس نے ایک خوفناک چیخ ماری
خرررررر
اور پھر آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھنے لگی
حمزہ نے فوراً ہینڈل کو زور سے کھینچ لیا
چڑررررر
اگلے ہی لمحے وہ بڑا لوہے کا دروازہ آہستہ
آہستہ کھلنے لگا
دھم
دھم
دروازے کے پیچھے مکمل اندھیرا تھا
اور وہاں سے عجیب سی ٹھنڈی ہوا باہر آ رہی
تھی
فراز نے حیرت سے کہا
"تم نے دروازہ کھول دیا"
حمزہ نے کہا
"شاید یہی واحد راستہ ہے"
وہ مخلوق اب بہت قریب آ چکی تھی

اس کی سرخ آنکھیں غصے سے جل رہی تھیں
حمزہ نے فوراً کہا
"اندر چلو"
تینوں فوراً دروازے کے اندر بھاگ گئے
جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے
اچانک پیچھے سے ایک بہت زور کی چیخ
سنائی دی
خرررررررر
وہ مخلوق بھی ان کے پیچھے دروازے کے اندر
داخل ہو گئی تھی
اور پھر
دروازہ خود بخود پیچھے سے بند ہونا شروع
ہو گیا
لوہے کا بڑا دروازہ آہستہ آہستہ بند ہونے لگا
حمزہ فراز اور کاشف اس کے اندر داخل ہو
چکے تھے مگر ان کے پیچھے وہ سرخ آنکھوں
والی مخلوق بھی اندر آ گئی تھی
کمرہ مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا

صرف کاشف کے موبائل کی ٹارچ جل رہی تھی
اس کی ہلکی سی روشنی میں کمرے کی
دیواریں ظاہر ہوئیں
اور جیسے ہی روشنی پھیلی...
تینوں کے قدم رک گئے
یہ جگہ کسی عام سرنگ جیسی نہیں تھی
یہ ایک بہت بڑا زیرزمین ہال تھا
گول شکل کا
اور اس کی دیواروں کے ساتھ درجنوں لوہے
کے پنجرے لگے ہوئے تھے
کچھ پنجرے ٹوٹے ہوئے تھے
اور کچھ کے اندر...
ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں
فراز کی آواز خشک ہو گئی
"یہ... کیا جگہ ہے..."
حمزہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا
دیواروں پر عجیب عجیب نشانات بنے ہوئے
تھے

کچھ جگھوں پر پرانی انگریزی میں تحریریں
بھی تھیں
جیسے یہاں کبھی کوئی تجربہ گاہ رہی ہو
کاشف نے سرگوشی کی
"یہاں... لوگوں کو قید کیا جاتا تھا..."
اسی لمحے کمرے کے پیچھے سے وہی خوفناک
آواز گونجی
وہ مخلوق اندھیرے میں ان کی طرف بڑھ
رہی تھی
اس کی سرخ آنکھیں ٹارچ کی روشنی میں
چمک رہی تھیں
حمزہ نے فوراً کہا
"آگے چلو"
تینوں ہال کے دوسرے سرے کی طرف بھاگنے
لگے
فرش پر زنگ آلود اوزار بکھرے ہوئے تھے
کچھ پرانے شیشے کے برتن بھی ٹوٹے ہوئے
پڑے تھے

فراز نے دوڑتے ہوئے کہا
"یہ واقعی تجربہ گاہ تھی..."
حمزہ نے کہا
"شاید وہی تجربہ جس نے انہیں مخلوق بنا دیا..."
اسی لمحے کاشف کی نظر ایک دیوار پر پڑی
وہاں ایک بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا
اس پر پرانی فائلیں اور کاغذات لگے ہوئے تھے
حمزہ فوراً اس کے پاس رک گیا
اس نے ایک پرانا کاغذ اٹھایا
اس پر انگریزی میں لکھا تھا

Project Nocturne – Biological Mutation Experiment

(پراجیکٹ نوکٹرن – حیاتیاتی تبدیلی کا تجربہ)

فراز نے حیرت سے کہا
"یہ کیا ہے"

حمزہ نے جلدی سے پڑھنا شروع کیا
"یہ... ایک خفیہ تجربہ تھا..."
کاشف نے پوچھا
"کس چیز کا"
حمزہ نے کاغذ کی اگلی لائن پڑھی
اور اس کا چہرہ فوراً سنجیدہ ہو گیا
"یہ لوگ انسانوں کو... ایک خاص وائرس کے
ذریعے تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے تھے..."
فراز نے کہا
"کس میں تبدیل کرنے کی"
حمزہ نے آہستہ سے کہا
"زیادہ طاقتور مخلوق میں..."
کاشف کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی
"اور وہ تجربہ... ناکام ہو گیا..."
حمزہ نے سر ہلایا
"ہاں... اور وہ لوگ یہی بن گئے..."
اسی لمحے پیچھے سے تیز قدموں کی آواز آئی
وہ سرخ آنکھوں والی مخلوق اب بہت قریب آ

چکی تھی
حمزہ نے فوراً کہا
"جلدی آگے چلو"
وہ ہال کے آخری حصے کی طرف دوڑے
وہاں ایک اور بڑا آلہ لگا ہوا تھا
ایک عجیب سی مشین
اس کے ساتھ کئی لیور اور بٹن لگے ہوئے تھے
اور اس کے اوپر ایک بڑی سرخ لائٹ لگی تھی
حمزہ نے فوراً ڈائری کے آخری الفاظ یاد کیے
"اگر تم واقعی انہیں روکنا چاہتے ہو...
تو اصل دروازہ بند کرنا ہوگا..."
فراز نے پوچھا
"کیا یہی ہے"
حمزہ نے کہا
شاید یہی وہ مشین ہے...
اسی لمحے وہ مخلوق ہال میں داخل ہو گئی
اس کی خوفناک چیخ گونج اٹھی
وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھنے لگی

کاشف گھبرا کر بولا
"جلدی کچھ کرو"
حمزہ نے فوراً مشین کے لیور کو پکڑ لیا
مگر وہ زنگ آلود تھا
وہ ہل نہیں رہا تھا
فراز اور کاشف نے بھی مل کر زور لگایا
اچانک وہ لیور حرکت کر گیا
اسی لمحے پورا ہال ہلنے لگا
دیواروں کے اندر کہیں گہرائی میں بھاری
دروازوں کی آوازیں گونجنے لگیں
شاید سرنگوں کے راستے بند ہو رہے تھے
مگر اسی لمحے وہ سرخ آنکھوں والی مخلوق
ان کے بالکل سامنے آ گئی
وہ صرف چند قدم کے فاصلے پر تھی
اس کے لمبے ناخن زمین پر رگڑ کھا رہے تھے
اور اس کی سرخ آنکھیں سیدھی حمزہ کی
طرف دیکھ رہی تھیں
کمرے کی سرخ لائٹ اچانک جل اٹھی

پورا ہال سرخ روشنی میں ڈوب گیا
اور پھر مشین سے ایک بھاری آواز گونجی
“System Activated...
Final Lockdown Initiated
(سسٹم آن کر دیا گیا ہے آخری ناکہ بندی
شروع کر دی گئ ہے)

فراز نے گھبرا کر پوچھا
“اس کا کیا مطلب ہے”
حمزہ نے مشین کی اسکرین کی طرف دیکھا
اور اس کے چہرے کا رنگ فوراً بدل گیا
کیونکہ اس پر لکھا تھا
All exits will be sealed...
in 60 seconds
(تمام خارجی راستے ایک منٹ میں بند کر دیے
جائیں گے)

یعنی

اب اس جگہ کے تمام راستے ہمیشہ کے لیے بند ہونے والے تھے
مشین کی اسکرین پر سرخ حروف چمک رہے تھے
کمرے میں سرخ ایمرجنسی لائٹ جل رہی تھی
پورا ہال عجیب سی سرخ روشنی میں ڈوب گیا تھا
اور اس روشنی میں وہ مخلوق اور بھی خوفناک نظر آ رہی تھی
اس کی سرخ آنکھیں غصے سے جل رہی تھیں
اس کے لمبے ناخن فرش پر رگڑ کھا رہے تھے
فراز گھبرا کر بولا
حمزہ اگر سب راستے بند ہو گئے تو ہم بھی یہی پھنس جائیں گے
کاشف کی سانس تیز ہو گئی
ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا
حمزہ نے مشین کی اسکرین کی طرف دیکھا
کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو چکا تھا

58...
57...
56...
وہ مخلوق آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی
اس کی چیخ پورے ہال میں گونج رہی تھی
حمزہ نے فوراً کہا
وہ دروازہ
اس نے ہال کے دوسری طرف اشارہ کیا
وہاں ایک تنگ سرنگ نظر آ رہی تھی
شاید ایمرجنسی راستہ
فراز فوراً سمجھ گیا
دوڑو
تینوں فوراً اس سرنگ کی طرف بھاگنے لگے
مگر وہ مخلوق بھی تیزی سے ان کے پیچھے لپکی
اس کے قدموں کی آواز ہال میں گونج رہی تھی

کاشف ہانپتے ہوئے بولا
یہ بہت تیز ہے
حمزہ نے پوری طاقت سے دوڑنا شروع کر دیا
سرنگ تنگ تھی اور اس کی چھت نیچی تھی
وہ تقریباً جھک کر دوڑ رہے تھے
پیچھے وہ مخلوق سرنگ کے دہانے تک پہنچ چکی تھی
اس کی سرخ آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں
کاؤنٹ ڈاؤن اب بھی چل رہا تھا
40...
39...
38...
سرنگ کے آخر میں ایک پرانا لوہے کا دروازہ نظر آیا
حمزہ فوراً اس تک پہنچا
اس نے دروازہ زور سے کھینچا
دروازہ کھل گیا

اس کے پیچھے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں
فراز نے کہا
جلدی
تینوں فوراً سیڑھیاں چڑھنے لگے
مگر پیچھے سے وہ مخلوق سرنگ میں داخل
ہو چکی تھی
اس کی چیخ سرنگ میں گونج رہی تھی
کاشف نے خوف سے پیچھے دیکھا
وہ بہت قریب آ چکی تھی
25...
24...
23...
سیڑھیاں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں
حمزہ کی سانس تیز ہو گئی
مگر وہ رکا نہیں
آخرکار وہ اوپر پہنچ گئے
وہاں ایک اور دروازہ تھا
حمزہ نے اسے زور سے دھکا دیا

دروازہ کھل گیا
وہ باہر آ گئے
وہ جگہ ہاسٹل کے پچھلے جنگل میں تھی
تینوں زمین پر گر کر ہانپنے لگے
اسی لمحے زمین کے نیچے سے ایک بھاری آواز
گونجی
شاید زیرزمین دروازے بند ہو رہے تھے
چند لمحوں بعد زمین ہلکی سی کانپی
پھر سب کچھ خاموش ہو گیا
فراز نے ہانپتے ہوئے کہا
"کیا... ختم ہو گیا"
حمزہ نے زمین کی طرف دیکھا
شاید واقعی وہ سرنگیں بند ہو چکی تھیں
کاشف نے آسمان کی طرف دیکھا
رات اب بھی گھری تھی مگر ہوا میں پہلے
جیسی دہشت نہیں تھی
مگر چند لمحوں بعد
حمزہ کی نظر اچانک جنگل کے اندھیرے میں

پڑی
وہ فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا
فراز نے پوچھا
"کیا ہوا"
حمزہ نے آہستہ سے کہا
"وہ... ابھی ختم نہیں ہوا..."
کیونکہ جنگل کے اندھیرے میں...
دور درختوں کے درمیان...
دو نہیں... بلکہ کئی سرخ آنکھیں ایک ساتھ
چمک رہی تھیں
حمزہ کی سانس ایک لمحے کے لیے رک گئی
فراز اور کاشف نے بھی اسی طرف دیکھا
اور پھر ان کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی
وہاں صرف ایک مخلوق نہیں تھی
بلکہ کئی سائے درختوں کے درمیان حرکت کر
رہے تھے
ان کی آنکھیں اندھیرے میں انگاروں کی طرح
جل رہی تھیں

کاشف کی آواز کانپ گئی
"یہ... یہ تو بہت زیادہ ہیں..."
فراز نے بے یقینی سے کہا
"مگر... سرنگیں تو بند ہو گئی تھیں..."
حمزہ خاموش کھڑا رہا
اس کے ذہن میں عمران کی ڈائری کے الفاظ
گونج رہے تھے
"سرنگ صرف ایک راستہ نہیں ہے...
شاید کچھ مخلوقات پہلے ہی باہر نکل چکی
تھیں
یا شاید جنگل کے نیچے اور بھی سرنگیں
موجود تھیں
درختوں کے درمیان وہ سائے آہستہ آہستہ
حرکت کرنے لگے
ان کی آوازیں رات کی خاموشی میں گونج
رہی تھیں
فراز نے دھیمی آواز میں کہا
"ہم یہاں نہیں رک سکتے..."

حمزہ نے سر ہلایا
"ہاں... ہمیں ہاسٹل چھوڑنا ہوگا..."
اسی لمحے ان میں سے ایک مخلوق درختوں
کے پیچھے سے تھوڑی سی آگے آئی
چاندنی اس کے چہرے پر پڑی
وہ وہی مخلوق تھی
لمبا سیاہ جسم
نوکیلے ناخن
اور سرخ آنکھیں
مگر اس کے پیچھے...
اور بھی کئی سائے کھڑے تھے
کاشف نے خوف سے کہا
"وہ ہماری طرف آ رہے ہیں..."
واقعی وہ مخلوقات آہستہ آہستہ جنگل سے
باہر نکل رہی تھیں
حمزہ نے فوراً کہا
"دوڑو"
تینوں جنگل کے راستے سے دور بھاگنے لگے

ان کے قدموں کے نیچے سوکھے پتے چرچرا رہے تھے
پیچھے سے خوفناک آوازیں گونج رہی تھیں
وہ مخلوقات بھی ان کے پیچھے آ رہی تھیں
چند منٹ تک وہ بغیر رکے دوڑتے رہے
آخرکار وہ ہاسٹل کے باہر سڑک تک پہنچ گئے
سڑک تقریباً خالی تھی
دور کہیں ایک گاڑی کی روشنی نظر آ رہی تھی
فراز زمین پر بیٹھ گیا
وہ بری طرح ہانپ رہا تھا
کاشف نے پیچھے جنگل کی طرف دیکھا
اب وہاں صرف اندھیرا تھا
کوئی سرخ آنکھ نظر نہیں آ رہی تھی
حمزہ بھی خاموش کھڑا جنگل کو دیکھ رہا تھا
کچھ دیر بعد فراز نے کہا
"شاید وہ واپس چلے گئے..."
کاشف نے تھکی ہوئی آواز میں کہا
"یا شاید ہمیں کھو دیا..."

مگر حمزہ کو یقین نہیں تھا
اسے لگ رہا تھا کہ یہ سب ختم نہیں ہوا
چند لمحوں بعد آسمان پر ہلکی سی روشنی
ظاہر ہونے لگی
صبح ہونے والی تھی
پرندوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں
رات ختم ہو رہی تھی
فراز نے کہا
"ہمیں پولیس کو سب بتانا چاہیے..."
کاشف نے سر ہلایا
"ہاں... مگر وہ یقین نہیں کریں گے..."
حمزہ نے آخری بار ہاسٹل کی عمارت کی طرف
دیکھا
وہ عمارت اب خاموش تھی
جیسے وہاں کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو
مگر حمزہ جانتا تھا...
کہ اس عمارت کے نیچے چھپا ہوا راز ہمیشہ
کے لیے ختم نہیں ہوا

کیونکہ جیسے ہی وہ سڑک کی طرف مڑا...
اس نے آخری بار جنگل کی طرف دیکھا
اور اس کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے
رک گئی
کیونکہ درختوں کے درمیان...
ایک بار پھر...
وہی سرخ آنکھیں چمک رہی تھیں
ہاسٹل کی اس آخری ہولناک رات کو گزرے اب
کئی ماہ بیت چکے تھے۔ زندگی آہستہ آہستہ
اپنی پٹری پر لوٹ رہی تھی۔ حمزہ نے اپنے
شہر کے پرسکون ماحول میں خود کو
مصروف کر لیا تھا تاکہ وہ پرانے سائے اس کا
پیچھا چھوڑ دیں۔ اب وہ راتوں کو اچانک
جاگتا نہیں تھا اور نہ ہی اسے وہ دیواروں پر
رینگتی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔
ایک اتوار کی دوپہر، حمزہ اپنے لیپ ٹاپ پر
کچھ کام کر رہا تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔
اسکرین پر "فراز" کا نام دیکھ کر اس کے

چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔
"السلام علیکم فراز! کیسے ہو بھائی؟" حمزہ نے خوش دلی سے پوچھا۔
"وعلیکم السلام حمزہ! میں بالکل ٹھیک، تم سناؤ؟ یار ایک خوشخبری ہے۔ کاشف کی کزن کی شادی ہے اگلے ہفتے، اور اس نے ہم سب کو خاص طور پر دعوت دی ہے۔ میں نے سوچا تمہیں کال کر دوں، ہم سب وہاں مل رہے ہیں۔" فراز کی آواز میں وہی پرانا جوش تھا۔
حمزہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ "کاشف کی کزن کی شادی؟ چلو یہ تو بہت اچھا بہانہ ہے سب سے ملنے کا۔"
"ہاں یار! اور سنو، مریم اور آمنہ بھی آ رہی ہیں۔ کاشف نے بتایا کہ وہ دونوں بھی شہر میں ہی ہیں اور انہوں نے آنے کا وعدہ کیا ہے،" فراز نے مزید بتایا۔
حمزہ کو ایک لمحے کے لیے ہاسٹل کی وہ آخری شام یاد آئی، لیکن پھر اس نے سر

جھٹک دیا۔ "ٹھیک ہے فراز، میں ضرور آؤں گا۔ ہمیں ملے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔"

ایک ہفتے بعد – شادی کی تقریب

شہر کا میرج ہال روشنیوں سے نہایا ہوا تھا۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ مہمانوں کی چہل پہل، لذیذ کھانوں کی خوشبو اور بیک گراؤنڈ میں بجتی دھیمی موسیقی نے ماحول کو بہت خوشگوار بنا رکھا تھا۔

حمزہ ہال میں داخل ہوا تو اسے اسٹیج کے قریب ایک میز پر فراز اور کاشف بیٹھے نظر آئے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔

"اوئے حمزہ!" کاشف نے اسے دیکھتے ہی آواز دی اور اٹھ کر گلے لگایا۔ "کتنے عرصے بعد دیکھ رہا ہوں تمہیں، بالکل بدل گئے ہو یار!"

فراز نے بھی مسکرا کر مصافحہ کیا۔ "ہاں بھائی، اب تو یہ بڑا بلاگر بن گیا ہے، ہمیں کہاں یاد کرے گا۔"

تینوں دوست بیٹھ کر پرانی باتیں کرنے لگے۔ یونیورسٹی کے قصے، ہاسٹل کے وہ دن (خوفناک یادوں کو چھوڑ کر) اور اب کی زندگی... سب کچھ اتنا نارمل تھا کہ حمزہ کو اپنی پرانی پریشانی پر ہنسی آنے لگی۔

کچھ دیر بعد ہال کے گیٹ پر مریم اور آمنہ نظر آئیں۔ مریم نے جامنی رنگ کا سادہ مگر نفیس جوڑا پہنا تھا ۔ آمنہ اس کے ساتھ ہنستی ہوئی باتیں کر رہی تھی۔

وہ دونوں سیدھی ان کی میز پر آئیں۔

"السلام علیکم! کیسے ہیں آپ سب؟" مریم نے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ اس کے لہجے میں وہی پرانی مٹھاس اور شائستگی تھی۔

"وعلیکم السلام! مریم، آمنہ... بیٹھو نا،" حمزہ نے کرسی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں بیٹھ گئیں اور باتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مریم اپنی نئی جاب کے بارے میں بتا رہی تھی اور آمنہ اپنی ماسٹرز

کی پڑھائی کے بارے میں۔ وہ سب ایک عام دوستوں کے گروپ کی طرح لگ رہے تھے جو طویل عرصے بعد کسی تقریب میں ملے ہوں۔
"سچ میں، اس دن کے بعد مجھے لگا تھا کہ شاید ہم کبھی نہیں مل پائیں گے،" آمنہ نے جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔
مریم نے اسے ٹوکا، "ارے آمنہ، پرانی باتیں چھوڑو۔ آج خوشی کا دن ہے، ہمیں بس انجوائے کرنا چاہیے۔"
حمزہ نے محسوس کیا کہ مریم پہلے سے کہیں زیادہ پر اعتماد اور خوش نظر آ رہی ہے۔
تقریب کے اختتام پر جب سب باہر نکل رہے تھے، تو فراز نے تجویز دی، "یار کیوں نہ کل ہم سب کسی کیفے میں ملیں؟ آج تو شادی کا شور تھا، سکون سے بیٹھ کر باتیں نہیں ہو سکیں۔"
"میرا خیال ہے یہ اچھا آئیڈیا ہے،" مریم نے فوراً تائید کی۔ "کل شام **6** بجے 'دی اولڈ کیفے'

میں ملتے ہیں؟"شادی کی تقریب اب اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہال میں مہمانوں کی تعداد کم ہونا شروع ہو گئی تھی اور ویٹرز میزیں صاف کرنے میں مصروف تھے۔ حمزہ، فراز، کاشف، مریم اور آمنہ اب بھی اپنی میز پر بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔

"سچ کہوں تو،" کاشف نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا، "آج تم سب سے مل کر ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ ہاسٹل والی باتیں کسی دوسری دنیا کا قصہ تھیں۔ ہم کتنا ڈر گئے تھے نا؟"

فراز ہنسا، "ڈرنا تو بنتا تھا یار! وہ حالات ہی ایسے تھے۔ مگر دیکھو، وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ اب ہم سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہیں اور وہ سب کچھ ایک پرانا قصہ بن گیا ہے۔"

مریم نے اپنی چائے کا کپ میز پر رکھا اور

بہت سکون سے ان کی طرف دیکھا۔ "بالکل ٹھیک کہا تم نے فراز۔ انسان کا دماغ بہت عجیب ہے، وہ خوف کو بھی وقت کے ساتھ ایک کہانی بنا دیتا ہے۔
حمزہ خاموشی سے مریم کو دیکھ رہا تھا۔ مریم کی باتوں میں ایک عجیب سی منطق تھی، مگر اس کا لہجہ ضرورت سے زیادہ سپاٹ **(Flat)** تھا۔ اس میں وہ پرانی جذباتی لہر مفقود تھی جو مریم کی شخصیت کا حصہ ہوا کرتی تھی۔
"آمنہ، تم بہت خاموش ہو؟" حمزہ نے اچانک پوچھا۔
آمنہ، جو اب تک خاموشی سے اپنے ہاتھ میں پکڑی چمچ سے کھیل رہی تھی، چونک کر اوپر دیکھنے لگی۔ "میں؟ نہیں... بس تھوڑی تھکن ہو گئی ہے۔ آج کافی ہلہ گلہ رہا نا۔" اس نے ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، مگر حمزہ نے نوٹ کیا کہ اس کی نظریں بار بار

مریم کی طرف اٹھ رہی تھیں، جیسے وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ بولنا نہیں چاہتی۔
"چلو، اب نکلنا چاہیے،" مریم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کل شام 6 بجے 'دی اولڈ کیفے' میں ملاقات پکی رہی۔ وہاں ہم سکون سے بیٹھیں گے۔"
سب ہال سے باہر نکل کر پارکنگ ایریا میں آ گئے۔ سرد ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ مریم اور آمنہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئیں جبکہ حمزہ، فراز اور کاشف اپنی اپنی گاڑیوں کے پاس کھڑے ہو کر آخری بار ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے تھے۔
"حمزہ، تمہیں نہیں لگتا مریم کچھ زیادہ ہی بدل گئی ہے؟" فراز نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اچانک پوچھا۔
حمزہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "بدل گئی ہے؟ مطلب؟"
"مطلب یہ کہ وہ پہلے بہت حساس تھی،

چھوٹی چھوٹی بات پر پریشان ہو جاتی تھی۔ مگر آج... وہ اتنی پرسکون تھی جیسے اسے کسی چیز کی پرواہ ہی نہ ہو۔ اور اس کی باتیں... بہت زیادہ فلسفیانہ نہیں تھیں؟" فراز نے اپنے وہم کا اظہار کیا۔

کاشف نے بیچ میں مداخلت کی، "یار تم لوگ بھی نا! بندی میچور **(Mature)** ہو گئی ہے تو تمہیں اس میں بھی مسئلہ ہے۔ چھوڑو یہ سب، کل ملتے ہیں۔"

کاشف اور فراز اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ حمزہ ابھی وہیں کھڑا تھا کہ اسے یاد آیا اس کا موبائل شاید میز پر ہی رہ گیا ہے۔ وہ جلدی سے واپس ہال کی طرف بھاگا۔

ہال اب تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ صفائی کرنے والے عملے کے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا۔ حمزہ اپنی میز کے پاس پہنچا تو اس کا موبائل وہیں پڑا تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا اور مڑنے ہی

والا تھا کہ اس کی نظر فرش پر پڑی۔
وہاں ایک چھوٹا سا ٹشو پیپر پڑا تھا جس پر لپ اسٹک یا شاید کسی سرخ رنگ سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ حمزہ نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ اس پر صرف ایک لفظ لکھا تھا: "مدد"۔
حمزہ کا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے ہال کے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ میز مریم اور آمنہ کی نشستوں کے بالکل قریب تھی۔ کیا یہ آمنہ نے لکھا تھا؟ یا مریم نے؟حمزہ نے وہ ٹشو پیپر اپنی جیب میں اس طرح چھپایا جیسے وہ کوئی جرم کر رہا ہو۔ ہال کی روشنیاں اب ایک ایک کر کے بجھائی جا رہی تھیں اور ہر بجھتے بلب کے ساتھ ہال میں پھیلا ہوا اندھیرا حمزہ کے دل میں ہاسٹل والی وہی پرانی وحشت پیدا کر رہا تھا۔
وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا اپنی گاڑی تک پہنچا اور انجن اسٹارٹ کیا۔ راستے بھر اس

کے ذہن میں مریم کا وہ پرسکون چہرہ اور آمنہ کی وہ خاموشی کسی فلم کی طرح چل رہی تھی۔ مریم کی وہ بات بار بار اس کے کانوں میں گونج رہی تھی: "انسان کا دماغ بہت عجیب ہے، وہ خوف کو بھی وقت کے ساتھ ایک کہانی بنا دیتا ہے۔"

حمزہ نے سوچا، کیا مریم یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ جو کچھ ہاسٹل میں ہوا وہ صرف ایک وہم تھا؟ مگر وہ زخم، وہ سرخ آنکھیں اور وہ عمران کی ڈائری... کیا وہ سب بھی کہانی تھی؟

گھر پہنچ کر حمزہ نے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ اس نے وہ ٹشو پیپر میز پر رکھا اور لیمپ کی تیز روشنی میں اسے غور سے دیکھا۔ لفظ "مدد" کے نیچے ایک بہت ہی باریک سا نشان تھا، جیسے کسی نے قلم سے چھوٹا سا دائرہ بنایا ہو۔ حمزہ نے اسے غور سے دیکھا تو وہ دائرہ نہیں بلکہ ایک "**3**" لکھا ہوا

تھا۔

"کمرہ نمبر 3؟" حمزہ کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ "کیا یہ پیغام ابھی بھی اسی ہاسٹل سے جڑا ہوا ہے؟"

اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور فراز کو میسج کرنے لگا، مگر پھر رک گیا۔ فراز اور کاشف پہلے ہی بہت مشکل سے اس خوف سے باہر نکلے تھے، وہ انہیں دوبارہ کسی وہم میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کل کیفے میں سب کچھ خود نوٹ کرے گا۔

رات کے تین بج رہے تھے جب حمزہ کی آنکھ کھلی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے کمرے میں کوئی موجود ہے۔ اس نے گھبرا کر بتی جلائی، مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ کھڑکی کا پردہ ہلکی ہوا سے ہل رہا تھا۔ وہ اٹھا اور کھڑکی بند کرنے کے لیے آگے بڑھا، تبھی اس کی نظر سڑک کے پار لگی اسٹریٹ لائٹ کے نیچے پڑی۔

وہاں ایک شخص کھڑا تھا۔ اس نے خاکی رنگ کی قمیض پہنی تھی جو ویٹرز کی وردی سے مشابہت رکھتی تھی۔ وہ بالکل ساکت کھڑا اوپر حمزہ کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
حمزہ نے آنکھیں مل کر دوبارہ دیکھا، وہ شخص اب بھی وہیں تھا۔ اس کا چہرہ سائے میں تھا، مگر اس کے کھڑے ہونے کا انداز... وہ بالکل سیدھا اور بے جان تھا۔
حمزہ نے ہمت جمع کی اور کھڑکی کھول کر آواز دی، "کون ہو تم؟ وہاں کیا کر رہے ہو؟"
اس شخص نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنا سر آہستہ سے جھکایا اور پیچھے مڑ کر اندھیرے میں چلنا شروع کر دیا۔ اس کے چلنے کی آواز بالکل نہیں تھی، جیسے اس کے پاؤں فرش کو چھو ہی نہ رہے ہوں۔ حمزہ نے دیکھا کہ اس کے سر کا پچھلا حصہ بالکل سپاٹ تھا، جیسے وہاں بال ہی نہ ہوں۔
حمزہ کی نیند اڑ چکی تھی۔ وہ پوری رات

جاگتا رہا۔ صبح ہوتے ہی اس نے کاشف کو فون کیا۔
"کاشف! یار وہ جو ویٹرز کل شادی میں تھے، کیا وہ تمہارے جاننے والے تھے یا کیٹرنگ کمپنی کے؟" حمزہ نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔
کاشف کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی، "کیا ہوا حمزہ؟ صبح صبح ویٹرز کا پوچھ رہے ہو۔ یار وہ تو ہال والوں کی اپنی ٹیم تھی۔ کیوں، کیا ہوا؟"
"کچھ نہیں... بس وہ ایک ویٹر مجھے تھوڑا عجیب لگا تھا۔ خیر، چھوڑو۔ شام کو ملتے ہیں نا؟" حمزہ نے بات ٹال دی۔
"ہاں بھائی! 6 بجے 'دی اولڈ کیفے'۔ مریم نے خود جگہ سیلیکٹ کی ہے تو اچھی ہی ہوگی۔" کاشف نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔
شام کے 5 بجے حمزہ کیفے کی طرف روانہ ہوا۔ 'دی اولڈ کیفے' شہر کے ایک پرانے حصے

میں واقع تھا جہاں عمارتیں کافی قدیم اور گلیاں تنگ تھیں۔ کیفے کا ماحول کافی پراسرار تھا، لکڑی کا فرنیچر اور مدھم پیلی روشنیاں۔ حمزہ پہنچا تو مریم اور آمنہ پہلے سے وہاں موجود تھیں۔ مریم ایک کونے والی میز پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی جبکہ آمنہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"السلام علیکم! میں جلدی تو نہیں آ گیا؟" حمزہ نے کرسی کھینچتے ہوئے پوچھا۔

مریم نے کتاب بند کی اور مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ آج کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔ "نہیں۔ ہم بھی ابھی آئے۔ آمنہ کو تھوڑی تازہ ہوا چاہیے تھی تو ہم جلدی نکل آئے۔"

حمزہ نے آمنہ کی طرف دیکھا۔ آمنہ کے چہرے پر گہرے حلقے تھے اور وہ کافی کمزور لگ رہی تھی۔ "آمنہ، تم ٹھیک ہو؟"

آمنہ نے جیسے ہی جواب دینے کے لیے منہ

کھولا، مریم نے اس کا ہاتھ میز کے نیچے سے پکڑ لیا۔ حمزہ نے نوٹ کیا کہ آمنہ کے چہرے پر اچانک ایک تکلیف کی لہر آئی، مگر اس نے فوراً اسے چھپا لیا۔

"میں ٹھیک ہوں حمزہ۔ بس... تھوڑا سر میں درد ہے،" آمنہ نے دبی آواز میں کہا۔

اسی لمحے فراز اور کاشف بھی پہنچ گئے۔ محفل جم گئی، مگر حمزہ کی تمام توجہ مریم کی حرکات پر تھی۔ اس نے دیکھا کہ مریم نے مینو کارڈ اٹھایا، مگر اس کی نظریں الفاظ پر نہیں بلکہ میز کے لکڑی کے ریشوں پر جمی ہوئی تھیں۔

ویٹر آرڈر لینے آیا۔ یہ وہ ویٹر نہیں تھا جو کل شادی میں تھا، مگر اس کا رویہ بھی کچھ ویسا ہی تھا۔ مریم نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا، "پانچ بلیک کافی۔"

"مریم! مجھے تو چائے پینی تھی،" کاشف نے ٹوکا۔

مریم نے اپنا سر آہستہ سے کاشف کی طرف موڑا۔ اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے بالکل ساکت ہو گئیں۔ "بلیک کافی دماغ کے لیے اچھی ہوتی ہے کاشف۔ یہ آپ کو... جاگنے میں مدد دیتی ہے۔" اس نے لفظ 'جاگنے' پر کچھ زیادہ ہی زور دیا۔

کاشف تھوڑا سا ہچکچایا مگر پھر خاموش ہو گیا۔ کیفے میں خاموشی چھا گئی، صرف باہر سے آتی گاڑیوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

حمزہ نے محسوس کیا کہ کیفے کی دیواروں پر بنے ان سب کے سائے روشنی کے حساب سے تھوڑے مختلف تھے۔ خاص طور پر مریم کا سایہ... وہ دیوار پر اتنا لمبا اور پھیل رہا تھا جیسے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ کوئی بڑی مخلوق ہو۔

حمزہ نے ہمت کی اور جیب سے وہ ٹشو پیپر نکال کر میز پر رکھ دیا۔ "مریم! یہ کل ہال میں تمہاری کرسی کے پاس گرا تھا۔ کیا یہ تمہارا

ہے؟"
آمنہ نے جیسے ہی وہ ٹشو پیپر دیکھا، اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ مریم نے بہت سکون سے اس کاغذ کو دیکھا، پھر حمزہ کی آنکھوں میں جھانکا۔
"مدد؟" مریم نے وہ لفظ پڑھا اور ہنسنے لگی۔
"حمزہ! تم اب بھی وہیں پھنسے ہوئے ہو۔ یہ کسی بچے کی شرارت ہوگی۔ دیکھو، اس کے پیچھے کسی نے '3' بھی لکھا ہے۔ شاید کوئی گیم کھیل رہا ہو۔" اس نے وہ ٹشو پیپر اٹھایا اور بڑی بے رحمی سے اسے مٹھی میں دبا کر کچرا دان میں پھینک دیا۔
حمزہ کو محسوس ہوا کہ مریم کا لہجہ اب وہ نہیں رہا جو کل تھا۔ اس کی آواز میں ایک ایسی طاقت تھی جو حمزہ کے دماغ پر بوجھ ڈال رہی تھی۔
"اچھا، میں ذرا واش روم ہو کر آؤں،" آمنہ اچانک اٹھی۔ اس کا لہجہ لرز رہا تھا۔

مریم نے اسے نہیں روکا، بس ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ آمنہ جیسے ہی مڑی، حمزہ نے بھی اٹھنے کا بہانہ کیا۔ "یار میں بھی ذرا ہاتھ دھو لوں۔"

حمزہ تیزی سے آمنہ کے پیچھے گیا۔ واش روم کی طرف جانے والی راہداری اندھیری تھی۔ آمنہ وہاں کھڑی دیوار کا سہارا لے رہی تھی۔ حمزہ نے قریب جا کر آہستہ سے کہا، "آمنہ! کیا ہو رہا ہے؟ وہ ٹشو پیپر تم نے لکھا تھا؟"

آمنہ نے خوف سے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کہیں مریم تو نہیں آ رہی۔ اس نے حمزہ کا بازو پکڑ لیا، اس کے ناخن حمزہ کی کھال میں چبھ رہے تھے۔

"حمزہ! وہ مریم نہیں ہے... وہ لوگ... وہ لوگ واپس آ گئے ہیں۔ وہ ہاسٹل کے نیچے سے نہیں، وہ ہمارے اندر سے نکل رہے ہیں۔ عمران... عمران نے مجھے پیغام بھیجا ہے۔ وہ... وہ 'بے دماغ' لوگوں کی فوج تیار کر رہی ہے۔ بھاگو

یہاں سے... اس سے پہلے کہ وہ تمہارا بھی..." آمنہ کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ راہداری کے دوسرے سرے پر مریم کھڑی تھی۔ وہ اندھیرے میں بالکل ایک سائے کی طرح لگ رہی تھی۔

"آمنہ؟ بہت دیر لگا دی تم نے؟" مریم کی آواز راہداری میں گونجی۔

آمنہ فوراً حمزہ سے دور ہو گئی اور سر جھکا کر مریم کی طرف چلنے لگی۔ حمزہ وہیں ساکت کھڑا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے پیچھے والی دیوار سے کوئی "سائیں سائیں" کی آواز آ رہی ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو دیوار کے ساتھ ایک ویٹر کھڑا تھا، اس کی آنکھیں بالکل سفید تھیں اور اس کے ہاتھ میں ایک لمبا انجکشن تھا جس میں کوئی نیلا مائع بھرا تھا۔

حمزہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ سب کوئی وہم نہیں تھا، یہ ایک باقاعدہ جال

تھا جس میں وہ سب پھنس چکے تھے۔

کیفے کی اس تنگ اور نیم تاریک راہداری میں وقت جیسے تھم گیا تھا۔ حمزہ کی پیٹھ دیوار سے لگی ہوئی تھی اور اس کے سامنے کھڑی آمنہ کی آنکھوں میں بکھرا ہوا خوف اسے یہ باور کروا رہا تھا کہ ہاسٹل کی وہ منحوس رات کبھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ مریم، جو چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی، اس کے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جو کسی انسان کی نہیں بلکہ کسی شکاری کی لگ رہی تھی۔
"حمزہ... تم اتنے پریشان کیوں ہو؟" مریم کی آواز میں ایک عجیب سی کھنکھناہٹ تھی۔
"آمنہ بس تھوڑی جذباتی ہو گئی ہے۔ پرانی یادیں کبھی کبھی انسان کو وہم میں ڈال دیتی ہیں۔"
حمزہ نے آمنہ کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا

جو اب مریم کے قریب آتے ہی بالکل ساکت ہو چکے تھے۔ مریم نے آگے بڑھ کر آمنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ حمزہ نے نوٹ کیا کہ مریم کی انگلیاں غیر معمولی طور پر لمبی لگ رہی تھیں، بالکل ویسی ہی جیسی انہوں نے ہاسٹل کی الماری سے نکلتے ہوئے دیکھی تھیں۔

"چلو آمنہ، دوست انتظار کر رہے ہیں،" مریم نے اسے نرمی سے موڑا، مگر اس کی گرفت میں ایک ایسی زبردستی تھی جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔

حمزہ وہیں کھڑا رہا۔ اس کا دل سینے میں ہتھوڑے کی طرح بج رہا تھا۔ جیسے ہی وہ دونوں راہداری سے باہر نکلیں، حمزہ نے مڑ کر اس ویٹر کی طرف دیکھا جو دیوار کے ساتھ ساکت کھڑا تھا۔ وہ ویٹر اب وہاں نہیں تھا۔ وہاں صرف ایک خالی جگہ تھی اور فرش پر ایک نیلا سا مائع گرا ہوا تھا جس سے کڑوے باداموں جیسی ناگوار بو آ رہی تھی۔

حمزہ واپس میز پر پہنچا تو دیکھا کہ فراز اور کاشف ابھی تک اپنی باتوں میں مگن تھے، مگر ان کے سامنے رکھی ہوئی بلیک کافی اب بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی اور اس کے اوپر ایک عجیب سی سفید جھلی **(Film)** جم گئی تھی۔
"یار حمزہ! تم کہاں رہ گئے تھے؟" کاشف نے پوچھا۔ "دیکھو مریم کہہ رہی ہے کہ ہمیں یہاں سے اب نکلنا چاہیے، وہ ہمیں اپنا نیا گھر دکھانا چاہتی ہے۔"
حمزہ نے فراز کی طرف دیکھا، فراز کی آنکھیں تھوڑی غنودگی میں لگ رہی تھیں۔
"فراز! تم ٹھیک ہو؟"
"ہاں... بس تھوڑا سر بھاری ہو رہا ہے۔ شاید کافی زیادہ کڑوی تھی،" فراز نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔
حمزہ کو فوراً احساس ہوا کہ ان کی کافی میں کچھ ملایا گیا ہے۔ اس نے آمنہ کی طرف دیکھا جو اب اپنی نشست پر بیٹھ کر

خاموشی سے اپنا پرس سنبھال رہی تھی۔
مریم کی نظریں حمزہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ اس کے ہر خیال کو پڑھ رہی ہو۔
"نہیں کاشف، ہم کہیں نہیں جا رہے۔ ہمیں گھر جانا ہے،" حمزہ نے دوٹوک لہجے میں کہا۔
مریم کی مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی۔
"حمزہ! اتنی جلدی کیا ہے؟ ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔"
اچانک کیفے کا مرکزی دروازہ جس پر بھاری زنجیر چڑھی تھی، زور سے بند ہوا اور زنجیر خود بخود چڑھ گئی۔ کیفے کے اندر موجود وہ دو تین ویٹرز جو اب تک خاموش کھڑے تھے، آہستہ آہستہ ان کی میز کی طرف بڑھنے لگے۔
حمزہ نے دیکھا کہ ان سب کے ہاتھوں میں وہی لمبے انجکشن تھے جن میں نیلا مائع بھرا تھا۔ ان کی آنکھیں مچھلی کی طرح سفید اور بے جان تھیں۔

"یہ کیا مذاق ہے مریم؟" کاشف نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی، مگر اس کے پاؤں نے جواب دے دیا۔ وہ واپس کرسی پر گر گیا۔

"یہ مذاق نہیں ہے کاشف۔ یہ 'بہتری' کی طرف پہلا قدم ہے،" مریم کی آواز اب بالکل بدل چکی تھی۔ یہ ایک بھاری، مشینی آواز تھی جو کیفے کی دیواروں سے ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ "تم لوگوں نے ہاسٹل میں جو دیکھا، وہ صرف ایک تجربہ تھا۔ اب میں تمہیں اس کا اصل نتیجہ دکھاؤں گی۔ انسان کا دماغ اس کی کمزوری ہے، میں اسے نکال کر تمہیں ایک ایسی فوج کا حصہ بناؤں گی جو کبھی تھکتی نہیں، کبھی ڈرتی نہیں۔"

اسی لمحے کیفے کی لائٹس بجھ گئیں۔ پورا ہال اندھیرے میں ڈوب گیا، مگر حمزہ کو اندھیرے میں بھی سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ مریم کی آنکھیں اب سنہری رنگ میں چمک رہی تھیں اور اس کے پیچھے کھڑے وہ "بے

دماغ" ویٹرز کسی روبوٹ کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے منہ سے وہی "سائیں سائیں" کی آواز نکل رہی تھی جو پھیپھڑوں کے خالی ہونے کا احساس دلاتی تھی۔
حمزہ نے جلدی سے اپنا موبائل نکال کر ٹارچ آن کرنی چاہی، مگر اس کا موبائل آن ہی نہیں ہو رہا تھا، جیسے کوئی لہر **(Frequency)** اسے جام کر رہی ہو۔
"حمزہ! بھاگو!" آمنہ کی چیخ سنائی دی، مگر اس کے فوراً بعد ایک ایسی آواز آئی جیسے کسی نے اس کا منہ دبا دیا ہو۔
اندھیرے میں ایک ویٹر نے فراز پر حملہ کرنے کی کوشش کی، مگر حمزہ نے تیزی سے میز پر رکھا ہوا بھاری گلدان اٹھایا اور اس ویٹر کے سر پر دے مارا۔ گلدان ٹوٹ گیا، مگر وہ ویٹر گرا نہیں، بلکہ اس نے اپنا سر آہستہ سے سیدھا کیا جیسے اسے کوئی درد ہی نہ ہوا ہو۔ اس کے سر کے پچھلے حصے سے خون کے بجائے وہی

نیلا مائع نکل رہا تھا۔
حمزہ نے کاشف اور فراز کے بازو پکڑے اور انہیں کھینچ کر کچن کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔ وہ دونوں تقریباً بے ہوش ہو چکے تھے۔ اسی لمحے کیفے کے سپیکرز میں ایک شدید خرخراہٹ پیدا ہوئی، جیسے کوئی ریڈیو فریکوئنسی میچ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔
پھر ایک آواز ابھری۔ ایک ایسی آواز جسے سن کر حمزہ کے قدم رک گئے۔
"حمزہ... بائیں طرف دیکھو... ڈیپ فریزر کے پیچھے... ایک خفیہ راستہ ہے... وہاں سے نکلو!"
یہ عمران کی آواز تھی۔ وہی آواز جو انہوں نے ہاسٹل کی پرانی ریکارڈنگز میں سنی تھی، مگر اب یہ آواز زیادہ واضح اور ٹھوس تھی۔
"عمران؟" حمزہ پکارا، "تم کہاں ہو؟"
مریم کی آواز میں غصہ لہرایا، "وہ کہیں نہیں ہے! وہ صرف ایک مرا ہوا ڈیٹا ہے!"

مریم نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور اچانک کیفے کی دیواروں سے کالے سائے نکل کر حمزہ کی طرف لپکے۔ حمزہ نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے کاشف اور فراز کو گھسیٹتے ہوئے کچن کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوا۔ کچن میں ہر طرف برتن بکھرے ہوئے تھے اور وہاں سے وہی کیمیائی بو آ رہی تھی۔

حمزہ نے اپنی پوری طاقت لگا کر اس بڑے ڈیپ فریزر کو دھکا دیا۔ جیسے ہی فریزر اپنی جگہ سے ہلا، اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی لوہے کی کھڑکی نظر آئی جو باہر ایک تنگ گلی میں کھلتی تھی۔

حمزہ نے پہلے فراز کو باہر نکالا، پھر کاشف کو۔ جیسے ہی وہ خود باہر نکلنے لگا، ایک ٹھنڈے اور سخت ہاتھ نے اس کا ٹخنہ پکڑ لیا۔ حمزہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہ مریم تھی۔ اس کا چہرہ اب انسانی نہیں رہا تھا، اس کی جلد مٹیالی ہو چکی تھی اور اس کے ناخن گوشت

میں پیوست ہو رہے تھے۔
"تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے حمزہ! تمہیں اس فوج کا حصہ بننا ہے!" مریم نے چیخ کر کہا۔
حمزہ نے اپنی دوسری ٹانگ سے مریم کے ہاتھ پر زور دار ٹھوکر ماری، مگر مریم کی گرفت نہیں ٹوٹی۔ اسی لمحے کچن کی لائٹ خود بخود جلی اور بجھنے لگی۔ دیوار پر لگے ایک پرانے ٹیلی فون سے اچانک ایک تیز روشنی نکلی جس نے مریم کی آنکھوں کو چدھیا دیا۔ مریم نے ایک تکلیف دہ چیخ ماری اور حمزہ کا پاؤں چھوڑ دیا۔ حمزہ نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔
باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ گلی سنسان اور تاریک تھی۔ حمزہ نے فراز اور کاشف کو ایک سائے میں چھپایا اور خود دیوار سے لگ کر ہانپنے لگا۔ اس کے دل میں کئی سوال تھے: عمران نے اسے کیسے بچایا؟

وہ ٹیلی فون سے روشنی کیسے نکلی؟ اور مریم کا وہ روپ... وہ اب ایک مکمل شیطان بن چکی تھی۔

تبھی حمزہ کی نظر گلی کے دوسرے کونے پر پڑی۔ وہاں ایک بوڑھا آدمی کھڑا تھا جس نے ایک لمبا کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک پرانی لالٹین تھی۔ وہ لالٹین کی روشنی کو ایک خاص طریقے سے ہلا رہا تھا، جیسے کوئی اشارہ دے رہا ہو۔

حمزہ ڈر گیا، مگر اس بوڑھے نے آہستہ سے اپنا کوٹ ہٹایا۔ اس کے سینے پر ایک بیج **(Badge)** لگا تھا جس پر لکھا تھا: **"Project Nocturne – Chief Observer"**۔

اس بوڑھے نے اشارہ کیا کہ وہ ان کے قریب آئے۔ حمزہ نے فراز اور کاشف کو سہارا دیا اور اس بوڑھے کے پاس پہنچا۔

"کون ہیں آپ؟" حمزہ نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

بوڑھے نے اپنی لالٹین حمزہ کے چہرے کے قریب کی، اس کی آنکھیں گہری اور غمگین تھیں۔ "میرا نام ڈاکٹر زاہد ہے۔ میں اس ہسپتال کا حصہ تھا جہاں یہ تجربہ شروع ہوا تھا۔ اور عمران... وہ مرا نہیں ہے۔ وہ مریم کے قید خانے میں ہے، مگر اس نے اپنا رابطہ بحال رکھا ہوا ہے۔ اس کا شعور اب شہر کے برقی نظام سے جڑ چکا ہے۔"

"مریم اسے کیوں نہیں مارتی؟" حمزہ نے پوچھا۔

"کیونکہ مریم کو سردار بنے رہنے کے لیے عمران کے دماغ کی اس صلاحیت کی ضرورت ہے جو اسے ان 'خالی وجودوں' پر قابو رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ مریم ایک حادثہ ہے، مگر عمران ایک تخلیق ہے۔" ڈاکٹر زاہد نے سڑک پر کھڑی ایک پرانی ایمبولینس کی طرف اشارہ کیا۔ "جلدی کرو، مریم کے سپاہی یہاں پہنچنے والے ہیں۔"

جیسے ہی وہ ایمبولینس میں بیٹھے، حمزہ نے دیکھا کہ کیفے کی چھت پر درجنوں سائے نما لوگ کھڑے تھے جن کے سروں کے پیچھے وہی آپریشن کے نشان تھے۔ وہ سب ایک ساتھ نیچے کودنے ہی والے تھے کہ ایمبولینس تیز رفتاری سے وہاں سے نکل گئی۔
ایمبولینس کے اندر کاشف اور فراز کو ہوش آنے لگا تھا۔ کاشف نے آنکھیں کھولیں اور لرزتی آواز میں بولا، "حمزہ... مریم... مریم نے آمنہ کا دماغ نکال لیا... میں نے اسے دیکھا... وہ آمنہ نہیں تھی... وہ اسے کٹھ پتلی کی طرح استعمال کر رہی تھی..."
کاشف کی بات سن کر حمزہ کا خون منجمد ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ جو آمنہ ان کے ساتھ بیٹھی تھی، وہ صرف ایک 'خالی برتن' تھا جسے مریم کنٹرول کر رہی تھی۔ اصل آمنہ اب ختم ہو چکی تھی۔
ڈاکٹر زاہد نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا، "پریشان

مت ہو حمزہ۔ ابھی ہم ایک ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں مریم کے سائے نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں تمہیں عمران کا دوسرا پیغام ملے گا۔"

حمزہ نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ شہر کی روشنیاں اب دور ہوتی جا رہی تھیں اور وہ ایک بار پھر اسی سیاہ جنگل کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں وہ ہولناک ہاسٹل واقع تھا۔ حمزہ کو احساس ہوا کہ کہانی وہیں ختم ہوگی جہاں سے شروع ہوئی تھی، مگر اس بار دشمن صرف ایک مخلوق نہیں بلکہ ان کی اپنی ایک دوست تھی جو اب پوری انسانیت کے لیے خطرہ بن چکی تھی۔

"ہم واپس وہیں جا رہے ہیں؟" حمزہ نے پوچھا۔

"ہاں، کیونکہ مریم کی اصل کمزوری اسی کمرہ نمبر 3 میں چھپی ہے،" ڈاکٹر زاہد نے اسٹیئرنگ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے جواب دیا۔

ایمبولینس کی رفتار طوفانی تھی، مگر گاڑی

کے اندر کی خاموشی اس سے بھی زیادہ ہولناک تھی۔ بارش کی بوندیں شیشوں پر کسی بے چین روح کے ناخنوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ حمزہ نے مڑ کر پچھلی نشست پر دیکھا جہاں فراز اور کاشف نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑے تھے۔ ان کے چہرے زرد پڑ چکے تھے اور سانسوں میں ایک ایسی آواز تھی جیسے کوئی پرانی مشین چل رہی ہو۔

"ڈاکٹر زاہد! کیا یہ بچ جائیں گے حمزہ نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

ڈاکٹر زاہد نے اسٹیئرنگ سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا، "ان کے جسم میں وائرس کی ایک ہلکی مقدار داخل کی گئی ہے۔ مریم انہیں مارنا نہیں چاہتی تھی، وہ انہیں 'خالی وجود' بنانا چاہتی تھی۔ اگر ہم اگلے دو گھنٹوں میں محفوظ مقام پر پہنچ کر انہیں اینٹی ڈوٹ (Antidote) نہ دے سکے، تو ان کا دماغ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گا۔"

حمزہ کا دل ڈوب گیا۔ "وہ محفوظ مقام کہاں ہے؟
"اسی ہاسٹل کے پرانے مردہ خانے (Mortuary) کے نیچے۔" ڈاکٹر زاہد نے ایک گہری سانس لی۔ "لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ہاسٹل صرف طلباء کے لیے تھا، مگر اس کے نیچے ایک پوری زیرِ زمین تجربہ گاہ تھی جہاں 'پراجیکٹ نوکٹرن' کے ابتدائی مراحل طے کیے گئے تھے۔ وہاں کی دیواریں سیسے (Lead) سے بنی ہیں، جو مریم کی ذہنی لہروں کو بلاک کر دیتی ہیں۔"
اچانک ایمبولینس کے اوپر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ چھت کی چادر ایسے مڑ گئی جیسے کسی طاقتور ہاتھ نے اسے اوپر سے دبا دیا ہو۔ حمزہ نے کھڑکی سے باہر دیکھا، سڑک کے دونوں طرف موجود درختوں سے وہ "بے دماغ" لوگ بندروں کی طرح چھلانگیں لگا کر گاڑی کی طرف لپک رہے تھے۔ ان کی سفید آنکھیں

اندھیرے میں جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں۔
"وہ آ گئے!" حمزہ چیخا۔
ایک "خالی وجود" نے گاڑی کے اگلے شیشے پر چھلانگ لگائی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور سر کے پیچھے سے وہی نیلا مائع بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنے سر سے شیشہ توڑنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر زاہد نے تیزی سے گاڑی کو لہرایا (Swerve) جس سے وہ مخلوق سڑک پر جا گری، مگر پیچھے سے درجنوں مزید آ رہے تھے۔
"حمزہ! ڈیش بورڈ کے نیچے ایک بٹن ہے، اسے دباؤ!" ڈاکٹر نے چلایا۔
حمزہ نے بٹن دبایا تو گاڑی کے چاروں طرف سے ایک تیز الیکٹرک شاک (Electric Shock) نکلا۔ باہر موجود مخلوقات تڑپ کر دور جا گریں، مگر ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ دور افق پر

ہاسٹل کی وہ منحوس عمارت نظر آنے لگی تھی، جو اب ایک قلعے کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ ہاسٹل کے پچھلے راستے سے اندر داخل ہوئے، جہاں جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ گاڑی بمشکل راستہ بنا پا رہی تھی۔ ڈاکٹر زاہد نے ایک پرانے گیراج کے اندر گاڑی روکی اور جلدی سے ایک خفیہ بٹن دبایا۔ فرش آہستہ سے نیچے کی طرف سرکنے لگا اور پوری ایمبولینس ایک لفٹ کی طرح زیرِ زمین تہہ خانے میں اتر گئی۔ نیچے پہنچ کر ماحول بالکل بدل گیا۔ یہاں کی روشنی نیلی تھی اور ہوا میں کلورین کی بو رچی ہوئی تھی۔ یہ وہی مردہ خانہ تھا جہاں کبھی لاوارث لاشیں رکھی جاتی تھیں، مگر اب یہ ایک جدید لیب میں بدل چکا تھا۔ ڈاکٹر زاہد نے فراز اور کاشف کو اسٹریچر پر لٹایا اور انہیں مختلف مشینوں سے جوڑ دیا۔ حمزہ وہیں ایک کونے میں بیٹھ گیا، اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

"حمزہ... یہاں آؤ،" ڈاکٹر زاہد نے ایک بڑی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ "عمران تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

جیسے ہی حمزہ قریب پہنچا، اسکرین پر عمران کا ڈیجیٹل چہرہ ابھرا۔ اس بار اس کا لہجہ زیادہ مستحکم تھا۔

"حمزہ... تم یہاں پہنچ گئے، یہ دیکھ کر مجھے سکون ملا۔ میری بات غور سے سنو۔ مریم نے اب صرف شہر نہیں، بلکہ ملک کے مین نیٹ ورک پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ وہ ایک ایسی لہر **(Frequency)** بھیجنا چاہتی ہے جو ایک ساتھ لاکھوں لوگوں کے دماغوں کو 'فارمیٹ' کر دے گی۔"

"ہم اسے کیسے روک سکتے ہیں؟" حمزہ نے پوچھا۔

"ایک ہی طریقہ ہے۔ مریم کا 'مرکزی اعصابی نظام' **(Core)** اسی ہاسٹل کے کمرہ نمبر **3** میں ہے۔ وہ خود تو وہاں نہیں ہے، مگر اس کا

اصل انسانی دماغ وہاں ایک خاص چیمبر میں محفوظ ہے۔ مریم کی روح اب ایک بادل کی طرح ہر جگہ موجود ہے، مگر اس کا جسمانی مرکز وہیں ہے۔ تمہیں وہاں جا کر ایک 'وائرس پروٹوکول' اپ لوڈ کرنا ہوگا جو میں نے تیار کیا ہے۔"

حمزہ ہکا بکا رہ گیا۔ "کمرہ نمبر **3**؟ وہ تو تباہ ہو چکا تھا!"

"نہیں حمزہ، وہ صرف ایک دھوکہ تھا۔ کمرہ نمبر **3** کے نیچے ایک اور چیمبر ہے جسے 'دی مدر چیمبر' کہتے ہیں۔ مریم وہاں سے اپنی طاقت لیتی ہے۔ تمہیں وہاں جانا ہوگا، اور یہ کام صرف تم کر سکتے ہو کیونکہ تمہارے دماغ کی لہریں اس وائرس سے مطابقت **(Sync)** رکھتی ہیں۔"

حمزہ نے اپنے کانپتے ہاتھوں کو دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ کیسے مریم نے اسے اپنا "سپہ سالار" بنانے کی بات کی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ

اس کہانی کا صرف ایک گواہ نہیں تھا، بلکہ وہ اس کا آخری ہتھیار تھا۔
ڈاکٹر زاہد نے ایک چھوٹا سا آلہ **(Device)** حمزہ کے ہاتھ میں دیا، جو کسی پرانے موبائل جیسا تھا مگر اس پر سرخ لائٹس جل رہی تھیں۔ "یہ وہ وائرس ہے جو عمران نے بنایا ہے۔ اسے مریم کے مین فریم میں لگانا ہوگا۔ مگر یاد رکھنا حمزہ، جیسے ہی تم اسے لگاؤ گے، مریم کو پتہ چل جائے گا اور وہ اپنی پوری قوت سے تم پر حملہ کرے گی۔"
"مگر میں اکیلا وہاں کیسے جاؤں گا؟" حمزہ نے پوچھا۔
"تم اکیلے نہیں ہو،" ڈاکٹر زاہد نے ایک الماری کھولی جس میں عجیب و غریب لباس اور ہتھیار رکھے تھے۔ "یہ وہ لباس ہے جو تمہارے دماغ کی لہروں کو چھپائے گا ۔ اور یہ... یہ ایک ساؤنڈ گن ہے، جو ان بے دماغ لوگوں کے کانوں کے پردے پھاڑ کر ان کا رابطہ مریم سے

توڑ دیتی ہے۔"
اسی لمحے پورے تہہ خانے میں ایک سائرن گونجنے لگا۔ اسکرین پر مریم کا چہرہ نمودار ہوا، مگر اس بار وہ مریم نہیں تھی، بلکہ ایک خوفناک سایہ تھا جس کی ہزاروں آنکھیں تھیں۔
"ڈاکٹر... تم نے بہت بڑی غلطی کی!" مریم کی آواز تہہ خانے کی دیواروں کو ہلا رہی تھی۔ "تم میرے مرکز کو نہیں چھو سکتے۔ حمزہ میرا ہے، اور وہ خود میرے پاس آئے گا۔"
اچانک تہہ خانے کی چھت میں دراڑیں پڑنے لگیں اور اوپر سے مریم کے وہ "بے دماغ" سپاہی بارش کی طرح نیچے گرنے لگے۔ ڈاکٹر زاہد نے ایک مشین گن اٹھا لی۔ "حمزہ! بھاگو! اس خفیہ راستے سے اوپر جاؤ، یہ سیدھا کمرہ نمبر 3 کے پچھلے حصے میں نکلتا ہے۔ میں انہیں یہاں روکتا ہوں!"
حمزہ نے فراز اور کاشف کی طرف ایک آخری

نظر ڈالی۔ وہ اب بھی مشینوں سے جڑے تھے، مگر ان کی آنکھوں میں ہلکی سی جنبش تھی۔ اسے پتہ تھا کہ اگر وہ ناکام ہوا، تو اس کے دوست کبھی نہیں جاگیں گے۔

وہ اس تنگ اور اندھیری سرنگ میں دوڑنے لگا جو اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے سے گولیوں اور "خالی وجودوں" کی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے جیسے وہ اوپر پہنچ رہا تھا، اسے وہی پرانی بو محسوس ہونے لگی جو ہاسٹل کے کمرہ نمبر 3 کی پہچان تھی۔

وہ سرنگ کے آخر میں پہنچا اور ایک بھاری ڈھکن کھولا تو وہ ہاسٹل کے اسی برآمدے میں تھا جہاں سے سب شروع ہوا تھا۔ مگر اب برآمدہ ویسا نہیں تھا۔ دیواریں گوشت کی طرح دھڑک رہی تھیں اور ان پر خون کی رگوں جیسے پائپ لگے تھے جو کمرہ نمبر 3 کی طرف جا رہے تھے۔

حمزہ نے ساؤنڈ گن کو مضبوطی سے پکڑا اور کمرہ نمبر **3** کے دروازے کی طرف بڑھا، جس پر اب ایک انسانی آنکھ بنی ہوئی تھی جو اسے دیکھ کر جھپک رہی تھی۔

"اب یا کبھی نہیں،" حمزہ نے خود سے کہا اور دروازے کو زور سے لات ماری۔

اندر کا منظر ایسا تھا کہ حمزہ کی روح کانپ گئی۔ کمرے کے عین درمیان میں مریم کا جسم ایک شیشے کے جار میں تیر رہا تھا، مگر اس کا سر کھلا تھا اور اس سے سینکڑوں تاریں نکل کر پوری عمارت میں پھیل رہی تھیں۔ کمرے کے گوشوں میں آمنہ اور کئی دوسرے لوگوں کے جسم لٹک رہے تھے، جن کے سروں سے ڈیٹا نکالا جا رہا تھا۔

"خوش آمدید حمزہ!" مریم کے اصلی جسم نے (جو جار میں تھا) آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ "تم نے یہاں آنے کی ہمت کی، اب تم کبھی واپس نہیں جا سکو گے۔

حمزہ نے محسوس کیا کہ اس کے قدموں کے
نیچے کا فرش سرد نہیں، بلکہ کسی جاندار کی
کھال کی طرح گرم اور نرم ہے۔
"حمزہ... تم نے یہاں آ کر اپنی موت کو دعوت
دی ہے،" مریم کی آواز اب صرف اس کے کانوں
میں نہیں، بلکہ براہِ راست اس کے دماغ کے
اندر گونج رہی تھی۔ "تم جسے 'وائرس' سمجھ
رہے ہو، وہ دراصل میری تکمیل کا آخری حصہ
ہے۔ ڈاکٹر زاہد اور عمران صرف مہرے ہیں،
اصل کھلاڑی میں ہوں۔
حمزہ نے اپنے ہاتھ میں موجود ڈیوائس کو
مضبوطی سے پکڑا۔ اس کی سرخ لائٹس تیزی
سے لپک رہی تھیں، جو اس بات کی علامت
تھی کہ وہ مریم کے مین فریم کے قریب ہے۔
اچانک، کمرے کے اندھیرے گوشوں سے سائے
ابھرنے لگے۔ حمزہ نے ساؤنڈ گن تانی، مگر اس
کا ہاتھ کانپنے لگا۔ سامنے آمنہ کھڑی تھی، اس
کا چہرہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہاسٹل کے

پہلے دن تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ پرانی چمک تھی، مگر اس کے گلے میں وہی نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

"حمزہ... رک جاؤ! اگر تم نے یہ کوڈ اپ لوڈ کیا تو میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاؤں گی،" آمنہ کی آواز میں وہی درد تھا جس نے حمزہ کو ہمیشہ کمزور کیا تھا۔ "کیا تم اپنی آمنہ کو مارنا چاہتے ہو

"یہ آمنہ نہیں ہے حمزہ! یہ تمہارے دماغ کی یاداشتوں کا غلط استعمال کر رہی ہے

اچانک حمزہ کے کان میں لگے ہیڈ فون سے عمران کی آواز آئی، جو اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ جلدی کرو... مریم کا سسٹم ملک کے مین گرڈ سے جڑنے والا ہے اگر ایک بار لہریں منتقل ہو گئیں تو پھر کوئی بھی 'خالی وجود' بننے سے نہیں بچ سکے گا

حمزہ نے دانت پیستے ہوئے اپنی آنکھیں بند کیں اور ساؤنڈ گن کا ٹرگر دبا دیا۔ ایک زوردار

لہر (Sonic Blast) کمرے میں پھیلی۔ آمنہ کا سایہ چیختا ہوا بکھر گیا، مگر اسی لمحے چھت سے چار 'بے دماغ' سپاہی حمزہ پر ٹوٹ پڑے۔
ایک سپاہی نے حمزہ کے کندھے پر اپنے ناخن گاڑ دیے۔ درد کی ایک لہر حمزہ کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اس نے ساؤنڈ گن کے دستے سے اس کے سر پر وار کیا اور اسے پیچھے دھکیلا۔ کمرے میں موجود وہ انسانی آنکھ جو دروازے پر تھی، اب تیزی سے گھوم رہی تھی اور حمزہ کی ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔
"تمہارا اینٹی ڈوٹ (Antidote) نیچے مردہ خانے میں ختم ہو چکا ہے، حمزہ،" مریم کے جار سے بلبلے نکلنے لگے۔ "تمہارے دوست فراز اور کاشف اب کبھی نہیں جاگیں گے۔ وہ میرے ڈیجیٹل جہنم کا حصہ بن چکے ہیں۔
حمزہ نے ہمت جمع کی اور مریم کے جار کے

بالکل نیچے موجود مرکزی ٹرمینل کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہاں سینکڑوں کیبلز ایک بڑے کمپیوٹر نما ڈھانچے میں جا رہی تھیں۔ جیسے ہی اس نے ڈیوائس کو پورٹ کے قریب کیا، فرش سے لوہے کی سلاخیں نکلیں اور حمزہ کے پیروں کو جکڑ لیا۔

نہیں

حمزہ چلایا۔

مریم کا چہرہ، جو جار کے اندر ساکن تھا، اچانک مسکرایا۔ اس کی آنکھیں کھلیں—وہ بالکل سفید تھیں، جن میں ڈیٹا کی لکیریں چل رہی تھیں۔

"اب لوڈنگ شروع ہو رہی ہے،" مریم نے کہا۔
پورے کمرے میں ایک تیز سیٹی کی آواز گونجنے لگی۔ دیواروں پر لگی اسکرینوں پر نقشے ظاہر ہونے لگے، جہاں ملک کے بڑے شہروں کو سرخ نشانات سے ظاہر کیا جا رہا تھا۔ یہ اس لہر کا آغاز تھا جو لاکھوں لوگوں

کے دماغوں کو 'فارمیٹ' کرنے والی تھی۔
حمزہ نے محسوس کیا کہ وہ ہار رہا ہے۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا اور وہ سلاخوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس نے آخری بار ڈیوائس کی طرف دیکھا، جس پر اب ایک نیا میسج چمک رہا تھا: "حمزہ، اپنے دماغ کو سنک (Sync) کرو۔ تمہارا درد ہی اس وائرس کا ایندھن ہے۔"
اسے سمجھ آگئی۔ یہ محض ایک کمپیوٹر کوڈ نہیں تھا، یہ ایک انسانی جذباتی ردِعمل تھا جسے عمران نے ڈیجیٹل شکل دی تھی۔ حمزہ نے ان تمام تلخ یادوں کو سوچنا شروع کیا جو اسے مریم اور اس ہاسٹل نے دی تھیں۔ اس کا غصہ، اس کی تکلیف، اور اس کا انتقام—سب ایک لہر بن کر اس کے ہاتھ سے ہوتی ہوئی ڈیوائس میں منتقل ہونے لگے۔
"تمہارا 'پراجیکٹ نوکٹرن' یہاں ختم ہوتا ہے، مریم!" حمزہ نے پوری قوت سے ڈیوائس کو

پورٹ کے اندر دھکیل دیا۔
جیسے ہی ڈیوائس کنیکٹ ہوئی، پورے ہاسٹل کی عمارت میں ایک ایسا جھٹکا لگا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ مریم کے جار کے اندر موجود نیلا مائع کالا پڑنے لگا۔ مریم کی چیخیں اب کمرے میں نہیں بلکہ پوری فضا میں گونج رہی تھیں۔
"یہ تم نے کیا کیا؟
تم نے مجھے مار کر خود کو بھی ختم کر لیا ہے!" مریم کا جسم جار کے اندر تڑپنے لگا۔
کمرے کی دیواریں (جو گوشت کی طرح تھیں) پگھلنے لگیں اور ان سے وہی نیلا زہریلا مائع بہنے لگا۔ اوپر سے چھت گرنے لگی تھی۔
حمزہ نے دیکھا کہ مریم کے سر سے جڑی تاریں ایک ایک کر کے ٹوٹ رہی تھیں۔
اچانک، اسکرین پر عمران کا چہرہ آخری بار نمودار ہوا۔ "حمزہ..
بھاگو .
یہ جگہ پانچ منٹ میں خود بخود تباہ ہو

جائے گی۔ میں نے سسٹم میں 'سیلف ڈیسٹرکٹ' **(Self–Destruct)** کمانڈ ڈال دی ہے۔ فراز اور کاشف کو ڈاکٹر زاہد نکال چکے ہیں۔ تم بس یہاں سے نکلو

حمزہ نے اپنی ٹانگیں سلاخوں سے چھڑائیں اور پیچھے مڑے بغیر اس ٹوٹتے ہوئے کمرے سے باہر کی طرف دوڑا۔ اس کے پیچھے مریم کا وہ جار ایک زوردار دھماکے سے پھٹ گیا اور پوری عمارت آگ کی لپیٹ میں آنے لگی

کمرہ نمبر **3** کے اندر ہونے والا دھماکہ اتنا شدید تھا کہ حمزہ کئی فٹ دور برآمدے میں جا گرا۔ آگ کے شعلے دیواروں پر لگی اس "گوشت نما" تہہ کو جھلسا رہے تھے اور فضا میں انسانی بال جلنے جیسی ناگوار بو پھیل چکی تھی۔ مریم کی چیخیں، جو کبھی پورے ہاسٹل میں گونج رہی تھیں، اب ایک دم گھٹی ہوئی سسکی میں بدل کر خاموش ہو گئیں۔ حمزہ نے لڑکھڑاتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی۔

اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور سر سے بہتے خون نے اس کی ایک آنکھ کو دھندلا دیا تھا۔

"حمزہ! جلدی کرو، سیڑھیاں گر رہی ہیں!" عمران کی آواز اس کے ٹوٹے ہوئے ہیڈ فون سے آخری بار ابھری اور پھر صرف شور **(Static)** باقی رہ گیا۔

حمزہ برآمدے سے بھاگتا ہوا سیڑھیوں کی طرف لپکا، جہاں آگ نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ پیچھے مریم کا

مدر چیمبر

مکمل طور پر تباہ ہو رہا تھا، اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام "بے دماغ" لوگ، جو مریم کے اعصابی نظام سے جڑے تھے، کٹی ہوئی پتنگوں کی طرح زمین پر ڈھیر ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی وہ وحشیانہ چمک ختم ہو کر ایک ابدی اندھیرے میں بدل چکی تھی۔

حمزہ جیسے ہی نچلی منزل پر پہنچا، اسے

دور گیراج کے دہانے پر ڈاکٹر زاہد کا سایہ نظر آیا جو فراز اور کاشف کے نیم بے ہوش جسموں کو ایمبولینس میں ڈال رہے تھے۔
حمزہ! ادھر
ڈاکٹر زاہد نے بلند آواز میں پکارا، مگر اسی لمحے ہاسٹل کی چھت کا ایک بڑا حصہ حمزہ اور گیراج کے درمیان گر گیا، جس سے راستہ مسدود ہو گیا۔
حمزہ آگ کے حصار میں پھنس چکا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، اس کے پیچھے ہاسٹل کی عمارت اب ایک جلتے ہوئے ڈھانچے کی طرح کھڑی تھی۔ اچانک اسے دیوار پر لگے ایک پرانے آئینے میں اپنا عکس نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نیلی جھلک تڑپی—مریم کا آخری وار۔ مریم مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی، اس نے اپنے ڈیجیٹل وجود کا ایک چھوٹا سا حصہ حمزہ کے شعور میں منتقل کرنے کی کوشش کی تھی۔

حمزہ کو احساس ہوا کہ اگر وہ باہر گیا، تو
مریم اس کے ذریعے دوبارہ زندہ ہو سکتی ہے۔
ڈاکٹر زاہد
گاڑی نکالیے
میں نہیں آ رہا
حمزہ نے پوری قوت سے چیخ کر کہا۔
"حمزہ، پاگل مت بنو! راستہ تلاش کرو
ڈاکٹر زاہد کی آواز آگ کے شور میں دب رہی
تھی۔
حمزہ نے اپنے ہاتھ میں موجود ساؤنڈ گن کو
دیکھا۔ اس نے گن کا رخ اپنی طرف کرنے کے
بجائے اسے ہاسٹل کے مرکزی گیس پائپ لائن
کے والو **(Valve)** کی طرف کیا جو دیوار کے
ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی،
اس کی آنکھوں میں فراز، کاشف اور آمنہ کے
چہرے گھوم گئے۔
عمران
تم نے کہا تھا کہ میرا درد ہی اس کا ایندھن

ہے۔ اب میرا سکون اس کا خاتمہ ہوگا
حمزہ نے ٹرگر دبا دیا۔
ایک زوردار دھماکے نے پوری عمارت کو لرزا کر رکھ دیا۔ ہاسٹل کا ڈھانچہ تاش کے پتوں کی طرح بکھر گیا اور آگ کے ایک بہت بڑے گولے نے رات کے اندھیرے کو دن کی روشنی میں بدل دیا۔
ڈاکٹر زاہد نے ایمبولینس کو پوری رفتار سے گیٹ سے باہر نکالا، جبکہ ان کے پیچھے وہ منحوس عمارت زمین بوس ہو رہی تھی۔
بارش اب تھم چکی تھی اور مطلع صاف ہو رہا تھا۔
ایک سال بعد
شہر اب بدل چکا تھا۔ "پراجیکٹ نوکٹرن" کی فائلیں سرکاری سطح پر جلا دی گئی تھیں اور اسے محض ایک گیس لیکیج کا حادثہ قرار دے کر دبا دیا گیا۔ فراز اور کاشف اب مکمل صحت یاب ہو چکے تھے، مگر انہیں اس رات

کا کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ ان کے لیے وہ صرف ایک بھیانک خواب تھا جو صبح ہوتے ہی ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر زاہد اب ایک چھوٹے سے قصبے میں پریکٹس کرتے تھے، مگر ان کی میز پر ہمیشہ ایک پرانی فائل پڑی رہتی تھی جس پر حمزہ لکھا ہوا تھا۔

کہانی کے آخری منظر میں، ہاسٹل کے اس ملبے پر جہاں اب گھاس اگ آئی تھی، ایک چھوٹا سا پودا لہراتا ہوا نظر آتا ہے۔ اچانک، فضا میں ایک بہت ہی دھیمی، ڈیجیٹل سی آواز گونجتی ہے—کسی کے ہنسنے کی آواز، جو مریم جیسی تھی... یا شاید وہ صرف ہوا کا جھونکا تھا۔

حمزہ کا جسم کبھی نہیں ملا، مگر شہر کے لوگوں کا کہنا ہے کہ آج بھی برسات کی راتوں میں اس پرانے ہاسٹل کے کھنڈرات سے ایک نیلی روشنی نکلتی ہے، جو یہ یاد دلاتی ہے کہ

کچھ راز کبھی دفن نہیں ہوتے۔
اختتام